شب خون

271

24/-

www.taemeernews.com

شب خون

اگست ۲۰۰۳

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

مدیر، پرنٹر، پبلشر: عقیلہ شاہین
فون نمبر: 91-532-2622693
E-mail : srfaruqi@sancharnet.in
فی شمارہ: چوبیس روپے
بارہ شمارے: دوسو چالیس روپے

سرورق: شاداب مسیح الزماں
کمپوزنگ: ریاض کمپیوٹرز، شارپ ٹریک کمپیوٹرز
سرنامے کی خطاطی: عادل منصوری
مطبع: انصاری آفسیٹ و پربھات آفسیٹ، الہ آباد
طالب علموں کے لئے سالانہ قیمت: دوسو روپے

جلد: ۳۸ شمارہ: ۲۷۱
ترسیل زر کا پتہ: ۳۱۳ رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
کوریئر کے لئے پتہ: 29C, Hastings Road
Allahabad-211001

1	گیڈمر کے خیالات	ادارہ	2
2	مردار خور	سید محمد اشرف	3
3	پاک ناموں والا پتھر	نیر مسعود	17
4	کشتی	انور قمر	24
5	مرد مجاہد مرد ناتواں	حبیب حق	27
6	پریمل اور پانچ دہائی پہلے الہ آباد کے شب و روز	بشن ٹنڈن (ترجمہ: نجم فاروقی)	52
7	زندگی کے خواب اور جشن انبوہ	اقبال مجید	60
8	دو چار قدم	مقصود الٰہی شیخ	64
9	تین دن بعد	آنند لہر	67
10	قاضی سلیم سے گفتگو	رشید انصاری	69
11	سوانحی گوشے	ادارہ	73
12	کہتی ہے خلق خدا	ادارہ	74
13	اخبار و اذکار، اس بزم میں	ادارہ	80

گیڈمر کے خیالات

گذشتہ شمارے میں ہم نے مشہور اور با اثر ماہر شرحیات (Hermeneutics) ہانس جارگ گیڈمر (Hans Georg Gadamer, 1900-2003) کے انتقال کی خبر چھاپی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو خراج تحسین کے طور پر اس کے بعض اہم خیالات یہاں بیان کئے جائیں۔

سب سے پہلی بات یہ کہ گیڈمر کے یہاں معنی کا انکار نہیں ہے۔ وہ معنی کو غیر قطعی اور غیر متعین بھی نہیں مانتا۔ دوسری بات یہ کہ وہ تحریری روایت کو معنی کی فہم کے لئے اہم ذریعہ قرار دیتا ہے۔ روایت پر اس زور کے باعث بعض لوگوں نے اسے ''رجعت پرست'' (Reactionary) کہا ہے، جس طرح آج ہمارے یہاں بعض لوگوں کو Neoconservative کہا جا رہا ہے کیونکہ وہ روایت کی بات کرتے ہیں۔ لیکن گیڈمر کے تصورات میں قدامت پرستی کچھ نہیں ہے۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ متن کی فہم ہمیشہ اس بات کی کوشش کا نام ہے کہ تاریخ میں جو تھا، حال کو اس سے دست و گریباں کیا جائے۔ وہ یاؤس (Jauss) کی طرح یہ نہیں کہتا کہ ماضی کے کسی متن کی تعبیر میں زمانۂ حال کا قاری یا معبر ماضی کے متن کو دوبارہ اس کی تاریخی نوعیت میں خلق کرتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ تعبیر ایسا عمل ہے جو جاری رہتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ گیڈمر کے خیال میں معبر کے تعصبات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ فہم و دانش کے زور پر ہم تعصبات کو تعبیر کے باہر نہیں کر سکتے، کیونکہ فہم و دانش خود بھی تاریخ کا حصہ ہیں اور مطلق یا خود مختار نہیں ہیں۔ ذیل میں ہم گیڈمر کی مشہور کتاب Truth and Method کے اقتباسات پیش کرتے ہیں:

(۱) تحریر محض ایک امر اتفاقی یا اضافہ وزائد نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے زبانی روایت کے ارتقا میں کوئی بنیادی تبدیلی ظہور میں نہ آئے۔ بے شک، لسانی معاشروں میں یہ ارادہ اور نیت ہو سکتی ہے کہ روایت کو جاری اور زندہ رکھا جائے، یعنی یہ نیت اور ارادہ ممکن ہے کہ تحریر کے بغیر ہی استقلال و استحکام حاصل ہو جائے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ صرف تحریری روایت کے لئے ممکن ہے کہ وہ ماضی کی زندگی کے باقی ماندہ ٹکڑوں اور نامکمل اجزا کی روائی و اجرائی سے خود کو الگ کر سکے، یعنی ایسے نامکمل حصوں، بخروں سے، جن کی بنیاد پر ماضی کو دوبارہ زندگی مل سکتی ہے... ماضی سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ استقلال و استحکام ہی کی نیت نے تواصل (continuity) کی وہ وحید (unique) صورت پیدا کی ہے جسے ہم ادب کہتے ہیں۔ ادب ہمارے سامنے محض یادگاروں اور نشانیوں کا ایک نظام نہیں پیش کرتا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ ادب نے ہر حال (Present) کے ساتھ اپنی ہی طرح کی وحدت زمانی حاصل کر لی ہے۔

(۲) فہم میں تعبیر ہمیشہ شامل ہوتی ہے۔ ادبی نقاد کا بھی کام یہی ہے کہ وہ متن کو قرأت پذیر اور مفہوم پذیر بنائے، یعنی غلط فہمیوں کے سدباب کے ذریعہ متن کی درست فہم کا تحفظ کرے... تعبیر کا منشا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ اس فن پارے کی جگہ لے لے جس کی تعبیر ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر، تعبیر اپنے سخن (utterance) کے شاعرانہ کردار کی بدولت قاری کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ [یعنی تعبیری سخن کتنا ہی شاعرانہ کیوں نہ ہو، وہ مقصود بالذات نہیں ہوتا۔]

(۳) معبر اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ وہ خود کو، اور اپنے تصورات و عقائد کو، تعبیر کے اندر داخل کر رہا ہے۔ لسانی تشکیل اور معبر کے ذہن کا تعلق اس قدر گہرا اور قریبی ہے کہ معبر کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ الگ سے کوئی شے بھی ہے... یہ ظاہر ہے کہ نشان (sign) کا اوزاری نظریہ، جس کی رو سے الفاظ اور تصورات محض کارآمد اوزار ہیں، تعبیری مظہرہ (phenomenon) کا اصل نکتہ سمجھ ہی نہیں سکتا... معبر الفاظ کو اس طرح نہیں استعمال کرتا جس طرح کوئی صناع اپنے اوزاروں کو اٹھاتا اور رکھتا ہے۔ ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ فہم لسان اور [الفاظ کے پس پشت] تصورات ہر وقت باہم دست و گریباں ہیں۔ ہمیں ایسے ہر نظریے کو مسترد کرنا چاہیئے جو لفظ اور شے کے درمیان قریبی وحدت کا منکر ہو۔

(۴) تحریر کی نوعیت لسان کی تجریدی عینیت (abstract ideality) کی ہے۔ لہٰذا ہر تحریر کے معنی کو دریافت کرنا اور انھیں دوبارہ بیان کرنا ممکن ہے۔ اس ''دوبارہ بیان'' اور متن کے درمیان جو شے متحد ہے وہ شے [یعنی وہ تصور] ہے جسے تحریری شکل دی گئی تھی۔ لہٰذا ''دوبارہ بیان'' کو تنگ اور سخت معنی میں نہ لینا چاہیئے۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم اس اولین سرچشمے تک پہنچ جاتے ہیں جس میں کسی لکھی یا بولی ہوئی کو موجود فرض کیا جائے۔ کسی تحریر کو سمجھنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کسی ایسی شے کو دوبارہ بیان کر رہے ہیں جو ماضی میں تھی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم موجود [یا حالی] معنی میں شریک ہو رہے ہیں۔

(۵) جیسا کہ ہم نے کہا، تمام تحریر [ایسا سخن ہے جو] تقریر سے جدا کر دیا گیا ہے، اور ہمیں اس کے نشانات (signs) کو دوبارہ تقریر اور معنی میں متبدل کرنا ہوتا ہے تاکہ ہم اسے سمجھ سکیں... بولے ہوئے لفظ کو سمجھنے کے لئے ہمارے پاس بہت سے تعبیری ذرائع موجود ہیں، مثلاً بولنے کا طریقہ، آواز کا لہجہ اور لے، ادائگی کی رفتار، وغیرہ۔ لیکن تحریر کے پاس ایسی کوئی معاون تعبیر اشیا نہیں ہوتیں۔

www.taemeernews.com

مردار خور

سید محمد اشرف

کوے جاناں کی طرف

گاڑی باہری سگنل کے پاس بھی نہیں پہنچی تھی کہ میں نے اپنا بھاری سوٹ کیس اٹھایا اور دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ سب سے پہلے اسٹیشن کے پیچھے کی سفید مسجد چمکی، پھر نام کا پیلا بورڈ گذرا، پھر گاڑی رک گئی۔ میاں بیوی سامنے ہی کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس ہنس کر میری طرف گرم جوشی کے انداز میں اشارے کر رہے تھے۔ وہ لپک کر آگے بڑھا۔ ویسا ہی تھا بس جوان ہو گیا تھا۔ چمکتی آنکھیں، کوتاہ پیشانی اور مضطرب چہرہ جس کی شہادت ہمہ وقت کانپتے ہونٹوں سے ملتی تھی۔ وہ بغیر استری کی پینٹ شرٹ پہنے تھا جس پر پرانا پوری آستین کا سوئٹر تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس سنبھال لیا اور ایک طرف جھک کر چلنے لگا۔ اس کی بیوی ۱۸-۱۹ سال کی ہوگی، گندمی رنگ، روکھے روکھے لمبے بال، بڑی بڑی گہری آنکھیں۔ وہ اس وقت خاموش تھی مگر مسکراتی ہوئی لگ رہی تھی۔

جب یہ بولتی ہوگی تب تو ہنستی ہوئی لگتی ہوگی۔ میں نے دل میں سوچا۔

اتنی سردی میں بھی اس نے صرف گہرے ہرے رنگ کا پرانا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں موٹا عنابی سوتی دوپٹہ پڑا تھا، جسے اس نے مفلر کی طرح گردن سے لپیٹ رکھا تھا۔ وہ آگے بڑھی، سلام کیا، اور میرے ہاتھ سے بندوق لیتے ہوئے بولی۔

"بندوق مجھے دے دو۔" اس کی آنکھیں اس کی زبان کا ساتھ دیتی تھیں۔

"ارے تم بندوق کا کیا کرو گی؟" بندوق ہاتھ سے نکلنے کے بعد میں کہہ پایا۔

"اسے بہت شوق ہے بندوق ہاتھ میں لے کر چلنے کا، اپنے کو پھولن دیوی سمجھتی ہے۔" اس کا نوجوان میاں رک کر دل لگی کے انداز میں بولا۔

واقعی اس نے بندوق کو ایک ماہر شکاری کی طرح اپنے کندھے پر اس طرح رکھ لیا تھا کہ نال کا رخ آسمان کی طرف تھا اور بندوق کے دستے پر اس کے ہاتھ کی گرفت ایسی تھی کہ انگلیاں ٹرائیگر کے پاس آ گئی تھیں۔ ہم شکاری لوگ بھی بندوق ایسے ہی رکھتے ہیں۔

"ارے تمھیں یہ سب کس نے سکھایا؟"

"اس ہیرو کے باپ سے سیکھا ہے۔" وہ مسکرائی تو ہنستی ہوئی لگی۔

"اب تو گھر تک تو چپ چاپ چل یا ساری نوٹنکی یہیں دکھا دے گی۔" اس کے میاں کی آواز میں بشاشت تھی۔

وہ جھوٹ موٹ سہم جانے والے انداز میں سمٹ سمٹ کے چلنے لگی۔

مجھے ہنسی آ گئی - اور تب مجھے خیال آیا کہ میں ان میاں بیوی کو میاں بیوی کیوں کہہ رہا ہوں۔ میں نے راحت کو اس کی پیدائش کے دن دیکھا تھا کہ اس وقت اس کا باپ مچھلی کے شکار پر گیا ہوا تھا اور جب وہ شکار پر جاتا تھا، اس دن میں اس کے ساتھ شکار پر ہوتا تھا یا اس کے گھر میں اس کی بیوی کی رکھوالی کرتا تھا۔ اس وقت میں ۱۰-۱۲ سال کا تھا اور اس کی بیوی مجھ سے خوب بڑی تھی، ۲۲ سال کی ہوگی۔

اس دن اس کے چہرے پر درد کی گہری لکیریں کھنچ آئی تھیں۔ وہ کوٹھری میں لیٹی رہی، میرے آنے پر اٹھی تک نہیں۔ وہیں پلنگ ہی پر بٹھا کر میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"دایہ کو بلوا لو۔ درد پیٹھ سے پیٹ کی طرف لپک رہا ہے۔" میں اس وقت اتنی وڈیا نہیں جانتا تھا۔ بس مجھے اتنا اندازہ ہوا کہ آج بھابھی کا ہاتھ بالکل ٹھنڈا تھا۔ ورنہ اس کے گرم گرم ہاتھ کے لمس کا بھی مجھے تجربہ تھا۔ وہ ملتانی مٹی کھاتی تھی۔ جب بھی میں نے حبیب سے کہا اس نے مجھ ہی پر ذمہ داری ڈال دی۔

"آپ ہی سنبھالو اسے۔" بس اتنا سنتے ہی میں اس کی مٹھی دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیتا تھا۔ وہ بھی چھڑانے کی کوشش میں میرے ہاتھوں پر جھول جھول جاتی تھی۔ میں خوب تندرست تھا۔ وہ دبلی پتلی تھی۔

پھر وہ گھٹنا اٹھا کر، آنکھیں نچا کر، شرارت سے کہتی تھی۔ "اِدھر اُدھر ماردوں گی۔ ہاتھ چھوڑو۔"

www.taemeernews.com

یہ وہ وقت ہوتا تھا جب میں اس کی مار سے بچنا بھی چاہتا تھا اور گرم گرم ہاتھ چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ تب حبیب میری مدد کو آتا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان کھڑے ہو کر اپنی بیوی سے پیار بھرے غصے کے لہجے میں کہتا۔

''مار کے تو دیکھ آکا کے۔''

اس کی مٹھی میرے ہی ہاتھوں میں کھلتی اور چکنی سفید ملتانی مٹی کا ٹکڑا فرش پر گر جاتا اور وہ بسورنے لگتی۔ میں جوتے کی ایڑی سے ملتانی مٹی کو اتنا رگڑ دیتا کہ وہ سرمہ بن جاتی۔ وہ ناراض ہو کر مجھے دھکا دے کر اپنی کوٹھری میں گھس جاتی اور انتظار کرتی کہ میں اسے منانے اندر جاؤں۔ حبیب اپنی لکھی، مچھلی کی ڈور اور کیچوؤں میں الجھا رہتا۔

میں ہنستا ہوا کوٹھری میں جاتا تو وہ مجھے کھینچ کر پلنگ پر گرا لیتی اور میری گردن، رخسار، ناک جو اس کے ہاتھ میں آتا مسلتی رہتی۔ حبیب اندر آ کر مجھے چھڑاتا جس سے مجھے خوشی نہیں ہوتی تھی۔ میرا دل چاہتا کہ وہ مجھے دیر تک ایسے ہی پریشان کرے۔ گرم گرم انگلیوں سے میری تکا بوٹی کر دے۔ مجھ پر لد لد جائے۔ پھر ہم دونوں میں دوستی ہو جاتی اور وہ تام چینی کے کپ میں میرے اور حبیب کے لئے چائے بنا کر لے آتی اور ہم دونوں میں سے جو پہلے ختم کرتا اس کی جھوٹی پیالی میں اپنے لئے چائے انڈیل لیتی۔

دایہ نے آتے ہی آسمان سر پر اٹھا لیا۔ حبیب اور اس کے مچھلی کے شکار کو مردانی گالیاں دیں اور پڑوس کی دو ایک عورتوں کو بلانے کو کہا۔ بھابھی کا درد بڑھ گیا تھا۔ میں بھاگا بھاگا گیا۔ پڑوس کی دو عورتوں کو تقریباً گھسیٹتا ہوا لایا اور دایہ کی بتائی ہوئی چیزیں گڑ، سونٹھ، شہد، روئی اور جانے کیا کیا الا بلا لینے سرپٹ بازار کی طرف بھاگا۔

بچے نے پیدا ہونے میں کئی گھنٹے لئے۔ جب کوٹھری کے اندر سے بچے کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز آئی تو عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ دایہ ایک ٹب میں لال لال خون ملا پانی اور بہت سی آلائش گندے کپڑوں سے ڈھک کر کوٹھری کے دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں بچے کے رونے کی آواز سن کر ایک فلمی گانا گانے لگا تھا۔ یہ تمام چیزیں دیکھ کر میری گھگھی بندھ گئی۔

''بھابھی زندہ ہے؟'' میں نے چلا کر پوچھا تھا۔

''ہاں ہاں۔ کھلاون دایہ کے ہاتھوں آج تک کوئی جچہ نہیں مری۔ آگے کو رام جانے۔''

میں کوٹھری میں گھسنے لگا تو پڑوس کے دھوبیوں کی عورتوں نے دھکا دے دے کر باہر نکال دیا۔ میں کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا۔ وہیں کھڑا رہا۔ مغرب کی اذان بھی ہو چکی تھی۔ دایہ کو میں نے اپنی جیب سے دس روپے دیئے، باقی حبیب کے آنے کے بعد دینے کا وعدہ کیا۔ پڑوس کی عورتیں حبیب کے آنے کا انتظار کرتے کرتے بڑبڑاتی ہوئی نکل گئی تھیں۔ میں کوٹھری میں داخل ہوا اور لالٹین جلائی جس کی روشنی میں بھابھی کی جگہ ایک کمزور عورت لیٹی تھی مگر اس کا چہرہ نارنجی ہو رہا تھا۔ پہلو میں کپڑوں میں لپٹا گہرے سانولے رنگ کا پھولے پھولے منہ کا ایک بچہ لیٹا تھا۔

میں بچے کو دیکھنے پلنگ کے دوسری طرف جانے لگا تو اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے روک لیا۔

''ارے بھابھی تمہارے بچہ ہو گیا اور حبیب کو اب تک پتہ بھی نہیں! کتنا مزہ آئے گا جب وہ یہ تماشا دیکھے گا۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی لیکن میرا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ غور سے دیکھا تو ان میں آنسو تھے۔ پھر میرا ہاتھ پکڑے پکڑے دروازے کی طرف جانے کا اشارہ کرنے لگی۔ میں نہیں گیا، ڈھیٹ کی طرح کھڑا رہا۔ تب اس نے بے بسی سے کراہ کر بچے کی طرف کروٹ لی اور بدقت اپنے لبادے کو اٹھا کر بچے کو دودھ پلانے لگی۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ وہ مجھ سے اپنا اندر کا بدن چھپانا چاہتی تھی۔ میں دائیں بائیں ہو گیا۔

اتنے میں دروازے پر آہٹ ہوئی۔ دروازے میں پہلے لکھی سے بندھی دو مچھلیاں اندر آئیں پھر حبیب در آمد ہوا۔

''اندر جا کر دیکھو اندر۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے لکھی لے کر کہا۔

''آج پھر مار پٹائی ہوئی کیا؟ رو رہی ہو گی؟''

''ارے نہیں۔ تم جا کر دیکھو تو سہی۔''

ہم دونوں اندر ایک ساتھ داخل ہوئے۔ جب اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئیں اور اس نے اپنی بیوی کو سینے سے بچہ لپٹائے دودھ پلاتے دیکھا تو وہ حیرت میں اتنے زور سے چلایا جیسے بچہ اس کی بیوی کے نہیں اس کے پیٹ سے نکلا ہو۔ بھابھی نے اس سے بات نہیں کی۔ منہ پھیرے لیٹی رہی۔ تب وہ جورو کے غلام کی طرح اپنی بیوی کے پاس زمین پر بیٹھ کر اس کا کندھا اور پیٹھ دبانے لگا۔ میں جلدی سے گھر کی طرف بھاگا کہ امی سے ان تینوں کے لئے اچھے اچھے کھانے اور دیگچی بھر دودھ لے آؤں۔

میں جب سامان لے کر گھر کے دروازے سے نکل رہا تھا تو ابا اماں سے کہہ رہے تھے۔

''ان رذیلوں سے ہمارے صاحب زادے کو جتنی دلچسپی ہے اس کا جواب نہیں۔''

اماں ابا کو سمجھانے لگی تھی کہ یہ دلچسپی شکار کے مشترکہ شوق کی وجہ سے ہے۔

''ہونہہ!'' ابا کی آواز ڈیوڑھی کے باہر تک سنائی دی تھی۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر اس نے میرا سوٹ کیس ایک پرانی، عجیب و غریب موٹر سائیکل کے کیریر پر باندھا اور بولا۔

''آکا! تم اس پر چلو۔ ہم لوگ یکے میں آتے ہیں۔''

''ابے یہ ہے کیا چیز؟''

''موٹر سائیکل ہے۔ بڑی تیز دوڑتی ہے۔ تین چار کو جوڑ کر ایک بنائی ہے۔ کوئی پرزہ اس کا، کوئی پرزہ اس کا۔'' ان کاموں میں وہ بچپن سے ہی بہت تیز تھا۔ باپ کی لکھی اٹھا کر بغیر زینے کی

www.taemeernews.com

چھت پر بلی کی طرح چڑھ جاتا تھا۔ حبیب دو دو گھنٹے اس کی خوشامد کرتا، پھر بازار سے میٹھی گولیاں لاکر کاغذ کی پڑیا میں باندھ کر اوپر اچھالتا تب لکھی نیچے پھینکی جاتی۔

وہ جب آٹھ سال کا تھا تو غلیل سے خرگوش مار کر اپنے چھوٹے سے کاندھے پر ڈال کر جنگل سے قصبے میں داخل ہوا تھا۔ حبیب اس کی ان حرکتوں پر اسے ہنس ہنس کر گالی دیتا جاتا اور پاس کھڑے لوگوں کے چہروں پر اپنے لونڈے کی کارکردگی کے نشان جھلملاتے دیکھ کر حلوائی سے جلیبیاں تلوانے لگتا۔

میں حبیب کے ساتھ تیتروں کے شکار پر جاتا۔ جب دور تک جنگل میں نکل جاتے اور مڑ کے دیکھتے تو اس کا لونڈا ہاتھ میں غلیل لئے جنگل میں ہم لوگوں کے جوتوں کے نشان کے سہارے ہماری طرف بڑھتا نظر آتا۔ پھر تھوڑی دیر بعد آکر ہم میں مل جاتا۔ کبھی حبیب اس کے چانٹے لگاتا کبھی میں۔ وہ چانٹے کھا کر ویسا ہی مطمئن نظر آتا جیسا تھا۔ ایک دن ہم لوگ مارا ہوا تیتر جھاڑیوں میں تلاش کرنے میں اتنے منہمک تھے کہ اسے چانٹے مارنا بھول گئے۔ وہ واحد دن تھا جس دن وہ سہا سہا ہمارے ساتھ گھومتا رہا۔ دو تین گھنٹے بعد ہمیں یاد آیا۔ حفیظ نے اسے پکڑ کر دو چانٹے لگائے تب وہ کلکاری بھر کر غلیل سے ہریلوں کو مارنے مہوے کے درخت کی طرف بھاگا۔

میں کالج سے ناغہ کر کے ابا کی بندوق اٹھا کر امی سے کارتوس اور تھیلا لے کر شکار کو نکلتا اور شام کو جب بعد مغرب داخل ہوتا تو بار بار کا دیکھا ہوا منظر نظر آتا۔ ابا بید لے کر آنگن میں ٹہل رہے ہوتے۔ اماں چولہے کے پاس بیٹھی ہانڈی پکا رہی ہوتیں۔ گھر کی بوا برتن مانجھ رہی ہوتی۔ بندوق رکھنے کے بعد میری طلبی ہوتی۔ اسکول سے ناغے کے نقصانات سمجھانے سے پہلے دو تین بید پڑ چکے ہوتے تھے۔ پھر اماں چولہے کی تیز آنچ کو کم کرنے کے لئے موٹی والی لکڑی کھینچ کر باہر رکھ لیتیں اور دوپٹہ سنبھالتی ہوئی میری طرف بڑھتیں اور شکار کا تھیلا ہاتھ میں لے کر ابا سے ناراض ہوتیں۔ پھر ہم اور ابا گھر کے نیم کے نیچے بیٹھ کر پرندوں کے پر ادھیڑتے۔ ابا اس دن مجھ سے بات نہیں کرتے لیکن اگر میرا مارا ہوا تیتر موٹا ہوتا تو امی کو بلا کر ضرور دکھاتے کہ دیکھو کتنا تیار تیتر ہے۔ میری سمجھ میں اس وقت یہ بات نہیں آتی تھی کہ مرا ہوا پرندہ تیار کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر کالج کی پڑھائی مکمل ہوئی تو ابا نے یونیورسٹی میں پڑھوانے کے لئے اپنا تبادلہ شہر میں کرا لیا۔ ہم سب لوگ شہر منتقل ہو گئے۔ یونیورسٹی کے زمانے میں بھی میرا وہاں جانا مستقل لگا رہا۔ ہر اتوار کو میں پہنچ جاتا۔ حبیب، راحت اور میں تینوں بھاؤپوکھرے کے تالاب کے پاس سے ہو کر نکلتے جس کے کنارے مردہ مویشی ڈالے جاتے تھے۔ پچاس پچاس سو سو کی تعداد میں ان پر گدھ چپنے ہوتے۔ کسی کسی وقت تو اصل جانور اس حد تک چھپ جاتا کہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ مرنے والا جانور بیل تھا کہ بھینس۔ گھنٹے آدھے گھنٹے میں سارا گوشت صاف ہو جاتا اور سفید ہڈیوں کا پنجر باقی رہ جاتا جسے ہڈی کے ٹھیکیدار کے بھنگی ملازم آ کر بیل گاڑی میں لاد لے جاتے۔ وہیں گھورے پر تلیروں کے جھنڈ پر راحت ایئر رائفل لے کر جم جاتا۔ وہ تلیر مارتا رہتا۔ ہم تالاب کے کنارے کی جھاڑیوں کے پاس کھڑے اندازہ کرتے رہے کہ اس کنارے سے سامنے تالاب میں پڑے تیج پر اچھے پڑیں گے یا اس کنارے سے۔

اتوار کی رات میں حبیب کے گھر ہی رکتا۔ آنگن میں میرے لئے سب سے اچھا پلنگ لگتا جس پر نگی دری اور میلا تکیہ ہوتا۔

جب میں خوب تیز مرچوں میں پکے تلیر کھا کر تھکا تھکا لیٹتا تو بھابی راحت سے کہتی، "آ کا کے پیر دبا دے۔"

وہ میرے پہلو میں بیٹھ کر چپی مالش کرنے لگتا اور چپی مالش سے متعلق ایک فلمی گیت گائے جاتا۔ بھابی میرے سرہانے پڑی چارپائی پر بیٹھ کر میرا سر دباتی رہتی اور مجھ سے پوچھتی رہتی کہ اب تم لوگ یہاں پھر کبھی واپس نہیں آؤ گے۔ سر پر اس کی انگلیاں نرم گرم لکیریں کھینچتی رہیں۔ میں غنودہ لہجے میں اسے جواب دیتا کہ اگر پڑھ لکھ کر ٹیچر بنا تو امید ہے کہ قصبے کے کالج میں آ کر نوکری کر لوں لیکن اس کا امکان ذرا کم ہے۔ میں سائنس پڑھ رہا ہوں نا۔ انجینیر یا ڈاکٹر بنوں گا۔ جب وہ یہ سب کچھ سنتی تو اس کی انگلیاں میرے سر پر رک جاتیں۔ تب پاس بیٹھا حبیب اسے تسلی دیتا۔

"آ کا، کہیں بھی رہیں اتوار اتوار ہم سے ملنے آتو جاتے ہیں۔"

"یہ بات تو ہے،" بھابی سر ہلا کر تائید کرتی۔ میں لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر اوپر دیکھتا جہاں بھابی کی آنکھیں، کندھے اور اوپری بدن ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سادہ سادہ سی مطمئن مسکراہٹ ہوتی۔ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتی تھی۔ یہ بات خود حبیب نے بتائی تھی۔

پھر میں علم الحیوانات کی ڈگری لے کر آندھرا پردیش کے ایک علاقے میں اطراف کے پرندوں کے خصائل کا مطالعہ کرنے والے پراجیکٹ میں مصروف ہو گیا۔ شروع شروع میں تو شکار کے واسطے آتا رہا لیکن پھر سب مشکل ہو گیا۔

آخری بار بھابی کے چہلم میں آیا تھا۔ اس سے پہلی بار جب آیا تھا تو بھابی کمزور نظر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے کالے حلقے پڑ گئے تھے اور بھرے بھرے گال دھنس سے گئے تھے۔ چہرے پر ہلدی سی گھنڈ آ گئی تھی۔ میں نے حبیب کو الگ بلا کر اس کی بیوی کی حالت کے بارے میں پوچھا۔

"ٹی بی ہے آ کا۔ آخری اسٹیج کی۔" وہ کچھ اس انداز سے بتا رہا تھا جیسے اپنا مارا ہوا ہرن دکھا رہا ہو۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ ہر نئی خبر کو اپنا کارنامہ سمجھتا تھا۔

میں آنگن میں لیٹا تو آج بھابی نہیں آئی۔ اس دن پورا چاند تھا۔ راحت چھت پر سو رہا تھا۔ نیچے میں حبیب اور بھابی تھے۔ جب وہ بہت دیر تک میرا سر دبانے نہیں آئی تب میں سمجھ گیا۔

"ادھر آؤ بھابی۔ آج تم میرے پاس نہیں بیٹھو گی۔"

"نہیں" وہ بھاری آواز میں بولی۔ "میرا مرض لگ جائے گا۔"

میں کانپ اٹھا۔ بھابی اپنے مرض سے واقف تھی۔ میرا دل نہیں مانا۔

www.taemeernews.com

"حبیب! بھابھی سے بول میرے پاس آ کر بیٹھے۔" حبیب نے ضد کی تب بھی وہ نہیں آئی۔ تب میں بستر سے اٹھا اور اسے اس کی چارپائی سے بکری کے بچے کی طرح گود میں اٹھا کر لے آیا۔ وہ بہت دبلی ہوگئی تھی۔ پہلے کتنی تگڑی تھی۔ جب تک نہیں چاہتی تھی، ملتانی مٹی والی مٹھی نہیں کھولتی تھی۔

وہ دھیمے دھیمے ہنستی رہی۔ میں نے اسے اپنے آرام دہ پلنگ پر لٹایا اور الٹا اس کا سر دبانے لگا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"دبانے دے، دبانے دے۔ مجھ سے تو خوب دبواتی ہے۔ تو نے تو ان کا اتنے دن تک سر دبایا ہے۔ اس کا کچھ تو بدلہ لے لے۔" وہ ہنس ہنس کر بولتا رہا اور سو گیا۔ بھابھی آنکھیں کھولے چاند کو دیکھتی رہی، بولی:

"تم اب شادی کر لو۔ راحت تیرہویں میں لگ گیا اب تم بھی چھبیس کے ہو رہے ہو۔ اپنی دلہن دکھا جانا۔"

"اچھا کر لوں گا۔" میں نے بات ٹال دی اور اس کے سر کو دھیمے دھیمے دباتا رہا۔ سونے سے پہلے اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے سر دبانے سے منع کیا۔ میں بھی غنودہ ہو رہا تھا۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے لئے سو گئی۔ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دیئے دیئے بیٹھے بیٹھے غنودہ ہو گیا۔

رات کو کسی وقت بے کلی ہوئی تو میری آنکھ کھلی۔ اس کی آنکھوں کے نرم پپوٹوں پر چاندنی پڑ رہی تھی جس سے آنکھوں کے سیاہ حلقے اور زیادہ واضح ہو گئے تھے۔ گھر کی منڈیر کے سائے میں اس کا چہرا آدھا چھپ گیا تھا۔ میں نے دھیمے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اس کے پلنگ پر جا کر سو گیا۔ صبح جانے سے پہلے حبیب کو ایک ہزار روپے کے نوٹ دیئے کہ بھابھی کا علاج کرانے میں کوتاہی نہ برتے۔

تھوڑے دن بعد کالج کے ماصاب کی رائٹنگ میں حفیظ کا خط ملا۔

"تمھاری بھابھی شب برات کی ۲۰ تاریخ کو ختم ہو گئی۔ عید کی دس تاریخ کو چالیسواں ہے۔"

جب میں جہلم میں پہنچا تو اسٹیشن پر حبیب اور راحت اداس اداس کھڑے تھے۔ راحت مجھ سے لپٹ کر "آکا، آکا!" کہہ کر چلانے لگا۔ حبیب میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ہم لوگ قبرستان گئے۔ کچی قبر میں وہ آرام کی نیند سو رہی تھی۔ فاتحہ پڑھ کر جب ہم گھر پر آئے تو حبیب نے ایک کاغذ کی پڑیا دی اور بتایا کہ اس میں ۸۰۰ روپے ہیں۔ تمھاری بھابھی دے گئی ہے تمھاری دلہن کی بالیوں کے لئے۔

میں موٹر سائیکل پر بیٹھا سست رفتاری سے گاڑی چلاتا رہا۔ راحت اور اس کی بیوی کا یکہ چرخ چوں چرخ چوں کر رہا تھا۔ اسٹیشن کے پاس والے باغ تو ویسے ہی نظر آئے جیسے تھے۔ پھر منظر اچانک بدل گیا۔ سیدوں والے باغ کی جگہ ایک رائس مل لگ گئی تھی۔ میں نے اور حبیب نے سیدوں والے باغ میں بہت بنیوے مارے تھے۔ اخیر نومبر کی خشک اداس شام ہوتی تھی۔ کھیتوں پر کہرے کے مرغولے ناچتے تھے۔ گیہوں کے چھوٹے چھوٹے پودوں پر نمی کے قطرے ہوتے تھے جو ہماری پتلون سے الجھ کر ٹانگوں کو اندر تک گیلا کر دیتے تھے۔ پھر ہم دھیمے دھیمے باغ کی منڈیر کو پھلانگ کر باغ میں داخل ہوتے۔ سوکھے پتوں کو پیروں سے بچاتے، بندوق کا رخ اوپر کئے، آنکھوں کو درختوں کی چوٹیوں پر مرکوز رکھے، سانس روکے روکے ہم دونوں آگے بڑھتے۔ بنیوے ذرا سی آہٹ پر پھرّ امار کر اڑ جاتے۔ فاختہ کی شکل کے مگر ذرا گہرے رنگ کے پھول دار بنیوے بہت چالاک ہوتے تھے۔ پیڑ کی چوٹی سے نیچے بیٹھنا شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ سب سے اوپر بیٹھتے تھے اور بہت سینہ تان کر بیٹھتے تھے۔ ان کی بیٹھک سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بنیوے ہیں یا فاختہ۔ حبیب کی ایک بری عادت یہ بھی تھی کہ وہ بندوق کے ایک فائر میں دو تین بنیوے مارنے کی فکر میں رہتا تھا تاکہ رات کو حلوائی کی دوکان پر فخریہ انداز سے اپنے کارنامے بیان کر سکے۔ لیکن بنیوے اتنا موقع کہاں دیتے تھے۔ ہوتا یہ کہ حبیب ایک درخت سے دوسرے درخت تک مارا مارا پھرتا اور بنیوے ایک درخت کی چوٹی سے اڑ کر باغ کے دوسرے کونے کے درخت کی چوٹی پر جا کر بیٹھ جاتے۔ بسیرے کے وقت وہ بھی باغ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ پھر اندھیرا اتنا ہونے لگتا کہ بنیوے دھندلکے میں مٹی کے کھلونوں کی طرح نظر آنے لگتے۔ بس اسی وقت مجھے غصہ آتا۔ میں حبیب کے ہاتھ سے بندوق چھین کر کسی ایک بنیوے کو نشانہ بنا کر فائر کر دیتا۔ وہ پتوں اور شاخوں سے الجھتا ہوا دھب سے زمین پر گرتا۔ حبیب میرے نشانے کی تعریف کے بجائے ہمیشہ اس تاسف کا اظہار کرتا کہ ذرا صبر کیا ہوتا تو دوسرا بھی مارا جاتا۔

"ایک بھی نہیں آتا ہاتھ۔ خالی جھولا جھلاتے گھر جانا پڑتا۔" میں بھی دل کی بھڑاس نکال لیتا۔

رائس مل کے آگے سیدوں کے حویلی سے ملحق زمین پر سڑک کے رخ پر دوکانیں بن گئی تھیں۔ سب ایک سائز کی تھیں، ایک رنگ کی اور سب کے شٹر ایک جیسے تھے۔

"لالہ اگروال نے وقف کی زمین پٹے پر لے کر دکانیں بنوائی ہیں۔" راحت نے میری آنکھیں پڑھنے کی کوشش کی۔

"تیرا باپ کیسا ہے؟" شکار کی دیرینہ جگہ پر نئی عمارتیں دیکھ کر مجھے پرانا ساتھی یاد آیا۔

"گھر میں پڑے ہانپ رہے ہوں گے۔ پچھلے مہینے سینے میں درد اٹھا۔ وہیں کولھو پر دل پکڑے پکڑے بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے مشین سے دل کا فوٹو نکالا۔ بتایا کہ آدھا دل بیکار ہو گیا ہے۔"

حبیب کو ہارٹ اٹیک ہوا ہو گا۔ موٹر سائیکل کے ہینڈل پر میرے ہاتھ نم ہونے لگے۔ "اسی لئے تار بھیج کر بلایا ہو گا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اب کے بیوی بولی۔ "ان کا علاج تو میڈیکل کالج کا چل رہا ہے۔ اب تو پہلے سے ٹھیک بھی ہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے موٹر سائیکل اور دھیمی کر لی اور ان کے یکے کے برابر اتنے نزدیک آ گیا کہ اس کی بیوی کی آنکھوں کی چمک کو پہلو سے بھی دیکھ سکتا تھا۔

www.taemeernews.com

''بستی سے گدھ غائب ہو گئے ہیں۔''

وہ بندوق کو شانے سے لگائے سڑک پر دیکھتے ہوئے کچھ افسردہ آواز میں بولی۔

''ہیں! گدھ غائب ہو گئے ہیں! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

وہ کچھ بولنا چاہتی تھی کہ راحت نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔ وہ چپ ہو گئی۔ اس بار وہ سچ مچ سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔

''آکا۔ تم گھر چل کر آرام سے بیٹھو۔ کھانا وانا کھا لو۔ پھر سب باتیں کریں گے۔''

یہ کہہ کر وہ بھی ایسے خاموش ہوا جیسے اس موضوع پر کچھ نہیں بولے گا۔

گدھ والی بات سن کر یکے والے کا چابک والا ہاتھ بھی بے حرکت ہو گیا تھا۔

اک آہوئے رمیدہ

حبیب باہر کی کوٹھری میں اوندھا لیٹا تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ موٹر سائیکل دروازے پر ہی رکی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر جھانک کر دیکھا اور اسی حالت میں دیوانوں کی طرح ہنسنے لگا۔ اس کی داڑھی بڑھ گئی تھی جس پر اس نے مہندی کا خضاب لگا رکھا تھا۔ لال داڑھی میں اس کے سفید سفید دانت کوٹھری کے نیم تاریک ماحول میں وحشت انگیز لگ رہے تھے۔ موٹر سائیکل روک کر، اسٹینڈ پر لگا کر اس کے پاس پہنچنے تک کے وقفے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی ہنسی کا سبب میری آمد کی خوشی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اب اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ اسی طرح لیٹا رہا۔ میں اس کی پیٹھ سہلاتا رہا۔ راحت اور سلطانہ کمرے میں داخل ہوئے اور ہم دونوں کو خاموش دیکھ کر اداس سے ہو گئے۔ لیکن یہ وقفہ مختصر تھا۔ حبیب سانسیں درست کر رہا تھا۔ پھر میں نے اس کے مختصر سے گھر کا ایک ایک کونا دیکھا۔ جہاں راحت پیدا ہوا تھا وہاں اب وہ اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ پلنگ بھی وہی تھا۔ مجھے یاد آیا ایک عورت نے اپنا لبادہ اٹھا کر ایک نوزائیدہ بچے کو یہیں دودھ پلایا تھا اور اس وقت اس کا چہرہ بچے کی پیدائش کے غرور اور ایک غیر مرد کے سامنے دودھ پلانے کی شرم سے سرخ ہو گیا تھا جو مغرب کے دھندلکے میں مجھے نارنجی لگا تھا۔ پھر میں آنگن میں آیا۔ میں لیٹا ہوا تھا۔ میرے سر کے اوپر ایک عورت کا اوپری بدن، چہرہ اور دو مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ اس رات بیماری کی کمزوری کے عالم میں وہ میرا ہاتھ پکڑے پکڑے سو گئی تھی اور میں اس کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیے غنودہ ہو گیا تھا۔

''چچا بلا رہے ہیں۔'' سلطانہ نے چپکے سے آ کر کہا۔ میں چونک گیا، جیسے پکڑا گیا ہوں۔

اب حبیب اپنے پلنگ پر اکڑا ہوا بیٹھا تھا جیسے اپنے بیٹے اور بہو سے کہہ رہا ہو۔

اگست ۲۰۰۳ / ۱۷ / ۲

''دیکھا۔ ایک ہی تار میں بلا لیا آکا کو۔''

میں نے اندازہ کیا کہ گھر کی مالی حالت اب بھی ویسی ہی ہے۔ حبیب نے زندگی بھر کولھو کی مشین چلائی۔ سرسوں کی فصل میں سرسوں خرید کر تیل نکال کر مقامی دوکانداروں کو تیل اور مویشی والوں کو کھل بیچ دیا کرتا تھا۔ میں کبھی کبھی بھابھی کے سامنے حبیب کو کولھو کا بیل کہہ کر چھیڑتا تھا۔

''کیوں بے کولھو کے بیل۔ کیا حال بنا رکھا ہے۔ راحت اور سلطانہ زور سے ہنسے۔ وہ بھی خوش دلی سے ہنسا اور بولا:

''اب یہ ہے کولھو کا بیل۔'' اس نے راحت کی طرف [illegible] اور یہ ہے اس کی مدارن جو اسے انگلیوں پر نچاتی ہے۔''

راحت پہلے جملے پر کچھ ذمہ دارانہ احساس کے ساتھ فخریہ انداز میں مسکرانے کو ہی تھا کہ دوسرے جملے نے اس کی ہنسی روک دی۔ سلطانہ زور زور سے ہنستی ہوئی باورچی خانے میں بھاگ گئی۔

''سلطانہ چائے بنا، دو انڈے تل کر لا۔ پراٹھے بھی بنا دے، آکا کو اچھے لگتے تھے۔'' حبیب نے بیٹھے بیٹھے احکامات صادر کیے۔

''لاتی ہوں لاتی ہوں۔ جلدی جلدی لاتی ہوں۔ اچھا اچھا پکاتی ہوں۔ چائے بھی لے کر آتی ہوں۔''

سلطانہ اندر سے گا گا کر شعر پڑھنے کے انداز میں ہنس ہنس کر جواب دے رہی تھی۔ حبیب اور راحت مسکراتے رہے۔ راحت تھوڑا شرمندہ سا تھا۔

''ابے حبیب۔ یہ بہو کہاں سے لے آیا۔ بڑی تیز ہے۔ منہ پھٹ۔ تجھے ہیرو کا باپ کہہ رہی تھی اسٹیشن پر اور دیکھ اس وقت کیسا گا رہی ہے۔'' میں نے حبیب کو چڑھایا۔ وہ یہ سن کر خوب زور زور سے ہنسا اور راحت کو دیکھ کر بولا۔

''ان حرام زادوں نے فلموں والی شادی کی ہے۔ ہیرو ہیروئن بن کر دوستی والی۔'' وہ آنکھ مار کر ہنسا مگر ایسے کہ راحت نہ دیکھ سکے۔

''ایک دن ہمارا لونڈا جو سالا آکا کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے، پڑوس کے ضلع میں ایک بارات میں گیا۔ وہاں اس نے پہلے تو غلیل کے کرتب دکھائے، اڑتا ہوا کوا مارا۔ سارا گاؤں جمع تھا۔ پھر گاؤں کے ٹھاکر کے لونڈے کی ایر گن سے موم بتیاں بجھائیں۔ پھر ایک بانس لیا اور سرکس والوں کی طرح نیم کی پھلنگ پر چڑھ گیا اور وہاں سے فاختہ کے انڈے صحیح سلامت لے کر نیچے بھی اتر آیا۔ دولہا گھوڑے سے اترا تو گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر گاؤں کے سات چکر لگائے۔ گھوڑا پسینہ پسینہ ہو گیا۔ سارا گاؤں دولہا اور برات کو چھوڑ کر اس کے چاروں طرف کھڑا ہو گیا۔ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میرے گھر لونڈا نہیں شیطان پیدا ہوا ہے۔''

''اس کے بعد کیا ہوا یہ بھی تو بتا۔''

''ہوتا کیا۔ لڑکی والوں کے گھر میں سلطانہ بچپن سے پل رہی تھی۔ اس کے ماں باپ موتی جھرے میں مر گئے تھے۔ سارے گاؤں کی لاڈلی تھی۔ کنویں پر پانی بھرنے جاتی تو نظر بچا کر ایک آدھ لونڈیا کو کنویں میں دھکیل دیتی پھر

www.taemeernews.com

جھم سے خود بھی کنویں میں کود جاتی اور لونڈیا کو بچالاتی۔ لاٹھی لے کر گاؤں کے چوکی دار کے ساتھ پہرہ دیتی۔ رات کے آخری پہر میں بڈھا چوکی دار سونے لگتا تو گدگدی کر کے اسے اٹھا دیتی۔ وہ اس کے ماں باپ کو کوستا تو کہتی تیرے کوسنے سے اب ہوگا کیا۔ میرے تو ماں باپ پہلے ہی مرگئے۔

گاؤں میں اسکاؤٹ کی ٹیم آئی تو لونڈوں کے ساتھ لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ کرتی۔ نیلے رنگ کا رومال گلے میں باندھ کر زمین پر تیر کے نشان لگاتی۔ پیڑوں پر پہچان کی چیزیں بناتی اور سب سے پہلے آگے کی پارٹی کو پکڑ لیتی۔ اسکاؤٹ ماسٹر نے اسے ایک سند بھی دی تھی۔ آٹھویں پاس ہے میری بہو۔ انگریزی بھی بول لیتی ہے۔

''انگریزی بھی؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

''جیسے... جیسے بلاڈی باسٹک، ڈیم فول، تھینک یو، سوری۔''

''ڈیم فول کسے کہتی ہے۔ تمھیں''؟ مجھے لگا میں مسکرا رہا ہوں۔

''نہیں آکا۔ ڈیم فول اور بلاڈی باسٹک تو یہ اپنے مرد کو کہتی ہے۔ مجھے تو یہ تھینک یو بولتی ہے جب شام کو سارے پیسے اسے لا کر دیتا ہوں۔ سویرے میرے کھانے میں دیر ہو جائے تو سوری بولتی ہے۔''

''ارے بارات والے دن کیا ہوا؟'' حبیب ہمیشہ موضوع کو آگے پیچھے کر دیتا تھا۔ ایک ہی فائر میں تین تین بٹیرے مارنے کی خواہش ابھی گئی نہیں تھی۔

''ہونا کیا تھا۔ اچانک اس کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی۔ ابے تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ جا کر دیکھ تیری ہیروئن نے انڈے تلے کہ نہیں۔''

''ابھی کہاں سے؟ بازار سے لے کر آتا ہوں۔'' راحت وہاں سے بھاگا۔

اب حبیب کے لہجے کا آہنگ بدلا۔

''ہونا کیا تھا آکا۔ بارات رخصت ہونے والی تھی، ٹیمپو اور جیپ تیار تھے۔ میٹاڈور پر جہیز کا سامان لد چکا تھا کہ سب میں بھگدڑ مچ گئی۔ سارے جوان لونڈوں کی قمیصوں میں مچھلی کے کانٹے کے ساتھ تتلی بندھی تھی اور تتلی میں چوہوں کی دمیں بندھی تھیں۔ لونڈے قلابازیاں کھا رہے تھے اور گاؤں کی لونڈیوں کے جھرمٹ میں گرے گرے پڑ رہے تھے۔ ارے کوئی ان سے پوچھتا کہ اتنی ہاہا کار کی کیا ضرورت تھی۔ چپکے سے قمیص میں سے کانٹا نکال دیتا تھا، چوہے بھاگ جاتے۔ مگر سالوں پر جوانی کا نشہ تھا نہ۔ تم جانو آکا لڑکپن اور جوانی میں تو چیونٹا بھی ٹیڑھا ٹیڑھا چلتا ہے۔ آکا تم بھی تو اپنی بھابھی کو لڑکپن میں کیسا کیسا پریشان کرتے تھے۔ اس کی ملتانی مٹی چھین کر چورا چورا کر دیتے تھے۔''

''ابے حبیب۔ تو اپنی بہو کی بات بتا رہا تھا، یہ بھابھی کا قصہ کہاں سے نکل آیا۔'' میں سٹ پٹا گیا تھا۔

''تمھاری بھابھی تو روز یاد آتی ہے آکا۔ نہیں یاد کروں تب بھی یاد آتی ہے۔ جس دن راحت پیدا ہوا تھا اور میں گھر میں مچھلی مار کر لایا تھا اور تم اپنے گھر دودھ لینے بھاگے تھے تو تمھارے جانے کے بعد تمھاری بھابھی نے میری پیٹھ پر دو ہاتھ مارے تھے کہ ہمارے بچہ ہونے والا تھا اور تم مچھلی کی لکھی لے کر نہر کی سیر کر رہے تھے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ بھاگوان میں کوئی ڈاکٹر حکیم ہوں کہ معلوم ہو جاتا کہ آج ہی بچہ پیدا ہوگا۔ پر وہ نہیں مانی۔ جب تک تم واپس نہیں آئے میری پیٹھ پر کئی گھونسے پڑ چکے تھے''۔

وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے ہنسنے لگا۔ میں نے جلدی سے موضوع بدلا۔

''ہاں پھر کیا ہوا۔ چوہے والی بات؟''

''ہاں تو لونڈے لونڈیوں کی طرف بھاگے۔ لونڈیاں گھروں کی طرف بھاگیں۔ پھر لونڈے ان کے دوپٹے چنریاں چھین چھین کر بارات کی طرف لوٹے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے ناراض ہوئے۔ نئی بیاہتا عورتیں گھونگٹ میں خوب ہنسیں۔ اور تو اور دلہن ہنستے ہنستے زمین پر بیٹھ گئی۔ کتنی مشکل سے اسے رخصتی کے لئے رلا پائے اس کے گھر والے۔ تب کسی نے راز کھولا کہ سلطانہ رات بھر چوہے دان میں چوہے پکڑتی رہی تھی۔ اتنے میں ہمارا اسکندر اعظم ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک دھانی دوپٹہ تھا۔ بولا سلطانہ کا دوپٹہ میں چھین کر لایا ہوں جیسے سالا جنگل سے نیل گائے مار کر لایا ہو۔''

یہ کہتے کہتے حبیب کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں وہی روشنی چمکی جو بچپن میں حلوائی کی دوکان پر جلیبیاں تلواتے وقت پیدا ہوتی تھی۔

''پھر کیا ہوا؟'' مجھے مزہ آ رہا تھا۔

''پھر آکا۔ میں نے دیکھا کہ سلطانہ گھر کے دروازے پر موٹی میلی چادر اوڑھے گم صم کھڑی ہے۔''

''گم صم کیوں حبیب؟''

''گم صم اس لئے کہ اس کے پاس ایک ہی تو نیا جوڑا تھا۔ ایک ہی تو اچھا دوپٹہ تھا۔ اس کے ماں باپ بچپن میں مرگئے تھے آکا۔''

''پھر؟''

''پھر''۔ اب حبیب تن کر بیٹھا۔'' پھر میں نے پہلے تو مچھلی کا کانٹا نکال کر چوہے کو آزاد کیا جو سالا کبھی راحت کی شرٹ میں گھستا کبھی میرے پاجامے کی طرف دوڑتا۔ پھر میں نے راحت کے دو چانٹے لگائے۔ تراخ تراخ۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ سے دوپٹہ لے کر سلطانہ کی چادر کے اوپر اڑھا دیا۔ تب وہ پہلی بار مجھ سے بولی اور وہ بھی انگریزی میں، 'تھینک یو'۔ ادھر ہمارے ہیرو صاحب بارات رخصت ہوتے وقت سلطانہ کو عرس کا میلہ گھومنے کی دعوت دے آئے۔ ایک دن سویرے سویرے کیا دیکھوں کہ سلطانہ ایک ٹین کی صندوقچی ہاتھ میں لئے اپنی خالہ کے ساتھ دروازے پر کھڑی ہے۔ بولی، 'چچا ہم عرس کا میلہ دیکھنے آئے ہیں۔ راحت بلا گئے تھے'۔

''خالہ تو دن بھر گھر میں بیٹھی پان چھالیہ کھاتی رہتی۔ بہت ہوا تو درگاہ پر جا کر نیاز دلا لائی اور یہ ہیرو ہیروئن صبح سے رات تک میلہ میں گھومتے رہتے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا سُدھ۔ میلے میں بھی ایسی آفت جوتی کہ خدا کی پناہ۔ تین

www.taemeernews.com

بارتو سرکس والوں نے شکایت کی کہ جب ان کا شیر پنجرے سے نکلتا ہے تو سب تو دم سادھے بیٹھے رہتے ہیں اور لونڈیا منہ پر دونوں ہاتھوں کا بگل بنا کر شیر کی آواز نکالتی ہے۔ شیر بے چارہ سہم کر پھر پنجرے میں چلا جاتا ہے۔ ایک دن سرکس چھوٹنے کے بعد ہاتھیوں کے باڑے میں جا کر چھوٹے ہاتھی کی سونڈ سے ہاتھ ملانے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ تو کھونٹر والا منیجر آ گیا۔ ورنہ بڑا ہاتھی سونڈ میں بھر کر پیال کی طرح چور چور کر دیتا۔''

اب حبیب سانس لینے کو رکا۔

''تب میں نے خالہ کو بٹھا کر کہا یہ کیسی لونڈیا ہے تو خالہ مسکرا کر بولی...''

''مسکرا کر یعنی اکیلے میں تمھارے ساتھ مسکرا کر؟'' حبیب ہنسا۔'' ارے آ کا۔ خالہ گاؤں بھر کی خالہ تھی، اس کی نانی کی سہیلی تھی۔ مجھ سے دس برس بڑی۔''

''اوہو ہو'' میں نے جھوٹ موٹ کے افسوس کا اظہار کیا تو حبیب کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

'' خالہ بولی۔ حبیب بھائی سلطانہ کے ماموں نے کہلایا ہے راحت ان سے بارات والے دن کہہ کر آیا ہے کہ وہ سلطانہ سے شادی کرے گا۔ اسی لئے مجھے بھیجا ہے کہ تم سلطانہ کو ٹھیک سے دیکھ سمجھ لو۔ آ کا میرے پاس دیکھنے سمجھنے کو کون بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا۔ لونڈیا کی مرضی کیا ہے۔ خالہ بولی۔ اے لئے سب سے موٹا چوہا تو سلطانہ نے ہی راحت کی قمیض میں باندھا تھا۔ شام کو جب دونوں میلہ گھوم کر آئے تو میں نے حرامزادوں کا سامنا نہیں کیا۔ آ کا ہمارے وقت میں کوئی ایسے شادی کی بات کی جاتی تھی کیا؟ ہم سالے باپ ہیں اور ہم سے کچھ پوچھا ہی نہیں کسی نے۔''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

'' میں اٹھا اور سیدوں کے باغ میں جا کر پڑ گیا۔ دوسرے دن اسٹیشن سے پیدل آنے والے مسافروں نے مجھے باغ میں لیٹے دیکھا تو جا کر راحت کو بتایا۔ دونوں میرے گم ہونے سے پریشان تھے۔ بھاگے بھاگے آئے۔ میں نے انھیں آتا دیکھا تو بیٹھے سے لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور چہرے پر غصہ لے آیا۔ دونوں میرے اِدھر اُدھر آ کر بیٹھ گئے۔ جگانے کی ہمت دونوں میں نہیں تھی۔ دونوں چپکے چپکے ایک دوسرے سے کچھ بولے چلے جائیں، لیکن مجھے جگانے کی ترکیب کوئی نہ کرے۔ پھر مجھے لگا سلطانہ اٹھ کر دور چلی گئی ہے۔ پھر اس کے رونے کی آواز آئی۔ راحت اسے چپانے اُدھر کو بھاگا۔ بس اسی وقت تمھاری بھابھی نے میری پیٹھ پر دو ہاتھ مارے۔''

''بھابھی نے؟ اب بھابھی کہاں سے آ گئی۔ وہ تو مر چکی۔''

''اس کی روح ہو گی آ کا۔'' اب حبیب کی آواز کہیں اور سے آ رہی تھی۔'' تمھاری بھابھی بولی۔ اٹھ کر ان دونوں کی شادی کر دو نہیں تو ایسے ہی مارتی رہوں گی۔ آ کا ایسے ہی تو وہ زندگی میں کرتی تھی نا؟''

حبیب اور اس کی بیوی کی زندگی کے واحد راز دار نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بس آ کا میں جاگا۔ جاگا کیا میں سو ہی کب رہا تھا۔ بس آنکھیں کھول دیں اور کراہ کر بولا یہاں کون ہے۔ دونوں بھاگ کر میرے پاس آئے۔ لونڈیا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہمارے لونڈے کا منہ بھی سوکھ گیا تھا۔ میں نے اسی کے دوپٹے سے اس کی آنکھیں پونچھیں تو آنسو اور زیادہ بہنے لگے۔ آ کا میں پونچھتا جاتا تھا وہ روتی جاتی تھی۔ بھل بھل آنسو بہہ رہے تھے۔ لونڈا بھی حیرت میں کھڑا ہم دونوں کا منہ تک رہا تھا۔

بس اسی وقت میں نے کڑک کر کہا لونڈیا تو آج ہی اپنے گھر واپس جا۔ ہم لوگ جمعے کی نماز پڑھ کر بارات لے کر آئیں گے۔ اتنے دن تک ہمارا لونڈا بھی اس کی صحبت میں رہا تھا، انگریزی بولنے لگا تھا۔ دونوں خوش ہو کر تھینک یو تھینک یو بولنے لگے۔ بس ہم دس بارہ لوگ حضرت میاں کے چھوٹے بیٹے کے ساتھ بارات لے کر گئے۔ انھوں نے ہی نکاح پڑھایا۔ سونے کی انگوٹھی اور دلہن کے کپڑے حضرت کے یہاں سے آ گئے تھے۔ جب ہم دلہن کو رخصت کرا کے واپس ہونے لگے تو میں نے گاؤں کی مسجد کے لئے اکیاون روپے دے کر بھرے مجمع میں کہا اس دن کی بارات میں تمھاری لڑکی نے ہمارے لونڈے کی قمیض میں چوہا باندھا تھا۔ آج ہم تمھاری بلی کو باندھ کر لے جا رہے ہیں۔ دلہن اچھی بھلی جھوٹ موٹ رو رہی تھی میرے اس کہنے پر کھل کھلا کر جو ہنسی تو گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے ایسے موٹے موٹے بکوٹے بھرے کہ دوبارہ سے سچ مچ رونے لگی۔ گھر آ کر دوسرے ہی دن بانہہ پر سے آستین ہٹا کر بکوٹوں اور چٹکیوں کے نشان دکھائے۔ میں نے راحت سے کہہ کر ہلدی چونا ملوایا۔''

اتنے میں آہٹ ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے اٹھائے، موٹا عنابی دوپٹہ اوڑھے ایک بلی کھڑی تھی جو بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر پا رہی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں چھوٹے سے آنگن میں آیا۔ ہاتھ کا نل چلا کر چلو میں پانی لے کر بڑی بڑی کلیاں کیں اور پیچھے مڑا تو سلطانہ کھڑی تھی۔

''دوپہر کو کیا کھاؤ گے؟''

''تمھارا سر۔''

''پھر رات کو کھانا کون پکائے گا؟'' اس کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔

''میں ایک ہی وقت کھانا کھاتا ہوں۔''

''پھر تو تم یہیں رہ جاؤ آ کا'' وہ ہنستی ہوئی چھوٹے سے باورچی خانے میں گھس گئی۔

''میں یہاں رہ جاؤں تو وہاں نوکری کون کرے گا۔''

'' میں کر لوں گی۔ تمھاری نوکری میں کام ہی کیا ہے۔ صبح ہوئی، دوربین لگائی، دور دور سے چڑیاں دیکھیں اور کاغذ پر لکھ دیا۔ لمبی گردن، کالی آنکھیں، چھوٹی چونچ، نیلا رنگ۔''

''ارے پگلی۔ اتنا آسان نہیں ہے۔ بہت پتہ مارنا پڑتا ہے۔ ایک

www.taemeernews.com

ایک بات کی ریسرچ کرنا پڑتی ہے۔مطلب جانچ کرنا پڑتی ہے۔''

''جیسے''؟ وہ قریب آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔اس کے روکھے بالوں کے نیچے گردن دھوئیں سے پیلی ہوگئی تھی اور اس کے بدن کی جوان عورت والی خوشبو باورچی خانے کی مختلف خوشبوؤں سے مل کر چھوٹے سے آنگن میں مینا کی طرح چاروں طرف پھدک رہی تھی۔

''جیسے ...جیسے ...کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں''۔ میں چپ ہوگیا لیکن معاً جی چاہا کہ کچھ دیر وہیں کھڑا اس سے باتیں کرتا رہوں۔

''جیسے پرندے کیا کھاتے ہیں۔کتنا کھاتے ہیں۔ان کی اوسط عمر کتنی ہوتی ہے۔کس موسم میں انڈے دیتے ہیں۔کتنے مہینے میں بچے نکلتے ہیں۔ماحول سے لڑتے ہیں تو ماحول کی جیت ہوتی ہے یا پرندوں کی۔انسانوں سے ان کا کتنا سابقہ ہوتا ہے۔انسانی آبادی کا پرندوں پر اور پرندوں کا انسانی آبادی پر کیا اثر پڑتا ہے۔انھیں کون کون سی بیماری ہوتی ہے۔یہ بیماری سے کیسے لڑتے ہیں۔یہ کون کون سی بیماریاں پھیلاتے ہیں اور ایسی ہی بہت سی باتیں۔ایک ایک پرندے پر ایک ایک کتاب کے برابر لکھنا ہوتا ہے۔''

وہ میرے پاس آئی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''اِس آبادی کے گِدھ کہاں چلے گئے آ کا؟ یہ معلوم کرو تو جانیں۔''

میں نے غور سے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں بہت وحشت تھی۔

شیشم کا جنگل

شام کو حبیب نے آنگن میں لیٹے لیٹے مجھے مطلع کیا کہ قصبے میں دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔گِدھ غائب ہوئے اور شیشم کے درخت سوکھ گئے۔

دوسرے دن حبیب اور راحت کے ساتھ جب میں بھاؤ پوکھرے پر پہنچا تو بہت سی یادیں ہوا کے ریلے کی طرح میرے بدن سے ٹکرائیں۔وہ زوال کا وقت تھا۔تالاب کے کنارے سے ذرا ہٹ کر دو تین مرے ہوئے بیل پیٹھ کے بل ٹانگیں آسمان کی طرف کئے پڑے تھے۔ادھر سے ہوا کا جھونکا آتا تو ان کی لاشوں کا تعفن ساتھ لے کر آتا۔اس قطعۂ زمین سے ذرا اونچائی پر اُگا شیشم کا جنگل غائب ہو چکا تھا۔اس حصے پر نظر ڈالنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی اجنبی جگہ کھڑا ہوں۔میری آنکھوں کا مانوس منظر ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا۔مجھے لگا جیسے میرے سینے میں ایک خلا ہے جو لحظہ بہ لحظہ پھیلتا جا رہا ہے۔

تالاب میں برائے نام پانی تھا۔اس پانی کے پاس بہت سے پرندے پوٹے کے بل بیٹھے آرام کر رہے تھے۔میں نے غور سے دیکھا۔وہ فاختائیں، چہے اور بگلے تھے جو غنودگی کی کیفیت میں تھے۔میں نے فاختاؤں کو بگلوں اور چہوں کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ان پرندوں اور فاختاؤں میں کوئی قدرِ مشترک چیز نہیں۔فاختہ کبوتر کی ذات کا خشکی کا پرندہ۔کیڑے مکوڑے کھانے والا۔اور اونچے درختوں پر بسیرا کرنے والا۔''یا حق تو''،''یا دوست تو'' کہہ کر حمد گانے والا۔بگلے اور چہے پانی کے کنارے زندگی کرنے والے پرندے۔چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کھانے والے۔لمبی لمبی ٹانگوں اور پھیلے ہوئے پنجوں اور لمبی سیدھی چونچوں والے۔لیکن اس وقت تالاب کی سوکھے ہوئے حصے میں دسمبر کی خنک دھوپ میں کتنے مزے سے ایک ساتھ بیٹھے دھوپ سینک کر آرام کر رہے تھے۔کچھ سوچ کر میرا دل دھڑکا۔خلافِ فطرت بات دیکھ کر اکثر میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔

میں جان بوجھ کر پرندوں سے کترا کر شیشم کے کٹے ہوئے جنگل والی لق ودق زمین میں داخل ہوا۔مرے ہوئے پھولے پھولے بیلوں کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے ناک پر رومال رکھ لیا تھا۔

شیشم کے جنگل کی زمین کے کنارے کنارے بے حیا کی جھاڑیاں تھیں اور اندر شیشم کے درختوں کی جڑوں کا سب سے نچلا حصہ رہ گیا تھا جنہیں ٹھیکے دار نے مقامی لوگوں کے لئے چھوڑ گیا ہوگا۔معاً میرے دل میں ایک خیال آیا۔کیوں نہ جڑ کی تھوڑی سی لکڑی لے کر اس کا کیمیکل اگزامنیشن کرایا جائے کہ آخر ان درختوں کے سوکھنے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔تھوڑی دیر تک میں درختوں کے اُس قبرستان میں گھومتا رہا۔تب حبیب نے بے تاب ہوکر مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں۔میں وہاں سے نکل کر چڑھائی چڑھ کر سڑک پر آ گیا۔

''حبیب! راحت سے بول شیشم کی جڑ کی تھوڑی لکڑی اور تھوڑی مٹی ایک بڑے ٹب میں بھر کر کل تک گھر بھجوا دے۔اس کا معائنہ کرنا ہے۔''

''اس کا گدھ سے کیا مطلب؟'' حبیب کی سمجھ میں بات نہیں آئی تھی۔میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔میں چپ رہا۔دیر تک چپ رہا۔

جب ہم لوگ بستی میں داخل ہوئے تو اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

''حضرت میاں کیسے ہیں حبیب؟'' میں نے اس سے دھیمے سے پوچھا۔

''اب گھر سے نکلنا بہت کم کر دیا ہے۔حجرے میں ہی بیٹھے رہتے ہیں۔بہت کمزور ہوگئے ہیں۔''

''مجھے پہچان لیں گے؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کیوں نہ پہچانیں گے؟ تم تو مرید ہوتے ہوتے وقت ہاتھ چھڑا کر بھاگے تھے۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''ارے وہ دوسری بات تھی۔اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی ایک بات۔'' میں جھینپ سا گیا۔

''کیا آج چلنا ہے ان کے پاس؟ یاد ہے ایک دن جب تیس رمضان کو عید کا چاند نظر نہیں آیا تھا تب سب لوگ ان کے پاس گئے تھے؟''

حبیب پرانی یادوں میں کھو گیا۔پھر دھیرے سے بولا۔''عشا کی نماز کے بعد چلیں گے۔راحت، جا کر کھانا تیار کرا دے آکا کے لئے۔''

''ابے لنڈھینگ اپنی بیوی سے کہنا زیادہ تکلف نہ کرے۔ابھی مجھے کئی دن رہنا ہے۔'' وہ مسکراتا ہوا تیزی سے بڑھ گیا۔

www.taemeernews.com

گھر میں گھستے ہی سلطانہ نے ہم سب کا راستہ روک لیا اور اپنے مخصوص انداز میں آنکھوں سے ہنس ہنس کر اپنے سر اور مجھ سے پوچھنے لگی۔

''اتنی دیر میں کیا ہوا
جاسوسی میں کیا ملا
گدھ کیوں بھاگے بستی سے
تم کیوں کھڑے ہو مستی سے۔''

''اتنی دیر میں تو نے یہی شاعری بنائی ہے کہ کچھ کھانا بھی؟ آ کا نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا'' حبیب دانت پیس رہا تھا اور مجھے لطف آ رہا تھا۔ میں نے اسے آنکھ کا اشارہ دیا تو وہ جھٹ سے بولی۔

''آنکھ مجھے مت مارو تم
کھانا جلدی کھالو تم
آلو گوشت پکایا ہے
تھوڑا چاول رائتہ ہے۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ حبیب جھڑکنے ہی والا تھا کہ راحت نے باورچی خانے سے نکل کر سلطانہ کی چوٹی پکڑ لی۔

''بالم میری چوٹی چھوڑ
نہیں تو دوں گی ہڈی توڑ۔''

وہ مسلسل گاتی رہی۔

''تیری ماں روئے تجھے''۔ حبیب نے عورتوں کی طرح اسے کوسا۔

''اماں میری مرگئی۔ اب میں تمھارے سرگئی''۔ پھر وہ خود ہی ہنستے ہنستے دوہری ہو کر ہم سبھوں سے ایک ساتھ لپٹ گئی۔ میں نے غور سے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''سورج مندتے وقت مجھے گھر میں اکیلے مت چھوڑ کر جایا کرو۔'' وہ راحت اور حبیب سے بولی۔

''اب تو نے نئے نخرے لگائے ہیں۔ کیا گھر میں جنات آتے ہیں؟'' حبیب بحث کے موڈ میں تھا۔

''ہاں جنات آتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم تجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔'' وہ اب ہنس نہیں رہی تھی۔

''کیسے ہوتے ہیں جنات؟''۔ حبیب نے نل پر منہ دھوتے ہوئے پوچھا۔

''سفید کرتا پاجامہ اور ململ کی ٹوپی۔ بڑی سی سفید داڑھی۔'' وہ نقشہ کھینچنے لگی۔

دیکھو آ کا! یہ کیسی حضرت میاں کا نقشہ کھینچ رہی ہے''۔

یہ سنتے ہی اس کا چہرہ بدل گیا۔ وہ کان پکڑ کر اٹھا بیٹھی کرنے لگی۔

''چچا تم پوری بات تو سنتے نہیں ہو۔ جنات کی آنکھیں تو کھڑی کھڑی ہوتی ہیں۔ آنکھوں سے آگ نکلتی ہے۔ ہمارے حضرت میاں کی آنکھیں تو غلافی آنکھیں ہیں یہ بڑی بڑی۔ پلکیں جھکی جھکی۔''

''اب یہ حضرت میاں پر بھی کوئی شاعری کرنے والی ہے۔'' حبیب میرے پاس آ کر بولا۔ ''حضرت میاں کے گھر میں اسے بہت چاہتی ہیں۔ جب دل چاہتا ہے اپنے پاس بلا کر اس کی نوٹنکیاں دیکھتی ہیں۔ اس کی شاعری سنتی ہیں۔ حضرت میاں کو پتہ چلتا ہے تو وہ بھی آنکھیں نیچی کر کے مسکراتے ہیں۔ کیسی بہو ہمارے گھر آ گئی اے اللہ۔'' وہ مصنوعی تاسف کا اظہار کر رہا تھا۔

پھر میرے پاس آ کر دھیمے سے بولا کہ بہو سن نہ لے۔

''لکھا دم ہے سلطانہ کا۔ ساری رونق اسی کے دم سے ہے اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں۔ سب اسی کے دم کا ظہورا ہے۔ باقی تو گھاس کوڑا ہے۔'' وہ ہم لوگوں کی شروع جوانی کے زمانے کا ایک بازاری شعر پڑھ کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

پھر میں نے مختصراً جو دیکھا تھا سلطانہ کو سب بتایا۔ وہ خاموش سب سنتی رہی۔ پھر بولی۔ ''مجھے بھی پوکھر پر لے چلنا آ کا۔ میں بھی سب اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی۔''

''ہاں ہاں لے چلیں گے۔ کھانا تو نکال نیک بخت۔'' حبیب تنگ آ کر بولا۔

حجرۂ شیخ

عشا کے بعد جب سناٹا ہو گیا، اور قصبے میں عشا کے بعد سناٹا ہو جاتا ہے، تب حبیب اور میں ان گلیوں میں داخل ہوئے جہاں بچپن، لڑکپن اور شروع جوانی کا ایک بڑا حصہ گذارا تھا۔ بجلی کے کھمبوں میں کہیں بلب تھے، کہیں نہیں تھے۔ اندھیرے اجالے میں ہوتے جب ہم درگاہ کے پاس پہنچے تو ہم دونوں کے ہاتھ غیر ارادی طور پر سلام کے لئے اٹھ گئے۔ خانقاہ کے حجرے میں ایک چھوٹا سا بلب جل رہا تھا۔ میاں کے ایک مرید نے بتایا کہ میاں انتظار کرتے کرتے ذرا لیٹ گئے ہیں۔

ہم دونوں جوتے اتار کر چپکے سے اندر داخل ہوئے۔ رومال سروں پر پہلے ہی باندھ لئے تھے۔

''میاں! السلام علیکم۔'' ہم دونوں نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' میاں نے ابھی چہرہ ہماری طرف نہیں کیا تھا۔ وہ سیدھی کروٹ پر ہاتھ کا تکیہ بنائے لیٹے تھے۔ گھٹنوں کو تھوڑا سا موڑ رکھا تھا اور بایاں ہاتھ ٹانگوں پر رکھا تھا۔ میاں سفید کرتا پاجامہ پہنے سر پر ململ کی ٹوپی لگائے ہوئے تھے۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھے۔ بہت کمزور لگ رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ پھر انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دئے۔ ہم لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔ چہرے پر ہاتھ پھیر کر انھوں نے سر نیچے کر لیا اور

www.taemeernews.com

خاموش بیٹھ گئے۔ یہ وقت ہمیشہ کی طرح مجھ پر سخت گزرتا تھا۔ میاں ایک ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے۔ وقفے وقفے سے بولتے تھے۔ رک رک کر سمجھا سمجھا کر۔ معاً میرے دل میں خیال آیا میاں مجھے پہچان پائیں گے کہ نہیں۔

''تم کیسے رہے اکرم بیٹا۔ بہت دن بعد میاں کی خبر لی۔ لگتا ہے اپنے پرندوں کے ساتھ بہت دور اُڑ گئے ہو۔''

یہ لفظ نہیں نکلے میاں کے منھ سے روشنی سی نکلی جس سے حجرہ روشن ہوگیا اور ہم لوگوں کے وجود سرشار ہوگئے۔

''میاں آپ کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا ہوگا کہ آپ کی کوئی نہ کوئی بات یاد نہ آتی ہو۔'' میں سر جھکائے بول رہا تھا۔

''ہاں! لیکن ماسٹر صاحب کی وفات کی اطلاع بھی نہیں دی۔ وہ تو کہو ان کے انتقال کے دن ہمارا ایک مرید بھی تمھارے شہر میں تھا اسی نے آ کر بتایا۔ ہم نے یہاں ان کا فاتحہ بھی کرایا تھا۔ دو قرآن شریف پڑھے گئے تھے۔ اللہ قبول فرمائے۔''

''آمین۔'' میرے منھ سے بے ساختہ نکلا اور میں شرمندگی میں نہا گیا۔ وہ سمجھ گئے۔ بولے۔

''باپ کی موت انسان کو آزاد کر دیتی ہے لیکن وقتی صدمہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ تم نے اطلاع نہیں کی تو تمھارا قصور نہیں، موت کے صدمے کا نتیجہ تھا۔'' انھوں نے غالباً میرے تغافل پر پردہ ڈالا تھا۔

''تمھاری بہو کیسی ہے حبیب؟'' میاں حبیب کی طرف مخاطب ہوئے۔

''ویسی ہی ہے میاں، منھ پھٹ زبان دراز، نہ چھوٹوں کا لحاظ نہ بڑوں کی شرم۔ آج ہی بتا رہی تھی کہ سورج غروب ہوتے ہی گھر میں جنات آ جاتے ہیں۔'' حبیب میاں کے چہرے کی طرف سہمے سہمے انداز میں دیکھ کر بولا۔

''اور نقشہ میرا جیسا بتاتی ہوگی۔ کیوں؟''

''ہاں میاں۔''

''ایک دن اہلیہ نے بھی یہی بات کہی تھی کہ راحت کی دلہن کو آپ کی شکل کے جنات نظر آتے ہیں۔'' میاں یہ کہہ کر سر جھکا کر دھیرے سے مسکرائے۔

''دل لگی کرتی ہے لڑکی۔ ماں باپ کی شفقت سے محروم رہی ہے۔ یہاں آ کر آزادی ملی۔ وہاں بچپن سے ماموں ممانی کے برتن دھوتے دھوتے پریشان ہوگئی تھی۔ گھر میں آ کر سب بتا جاتی ہے۔ تمھارے گھر کی روشنی ہے وہ حبیب۔''

''یہ بات تو ہے میاں۔'' حبیب نے دل ہی دل میں فخر کا جذبہ محسوس کیا۔

''میاں۔ بستی کے گدھ کہاں چلے گئے؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

باہر سے تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور میاں کے ریشم جیسی نرم سفید داڑھی سے کھیلنے لگا۔

''دروازہ معمور کر دو۔'' میاں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور سر جھکا کر خاموش ہوگئے۔

حبیب نے اٹھ کر دروازے کی کنڈی لگا دی۔ پھر بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ حالانکہ حجرے میں خنکی تھی لیکن میاں کے وجود نے ہمارے وجود کو گرم کر رکھا تھا۔

''کرگس کا کام کیا ہوتا ہے؟'' میاں دیر کے بعد بولے۔

''مرے ہوئے مویشی ڈھور ڈنگر کھانا۔'' میں بولا۔

''اس سے ہمارا کیا فائدہ ہوتا ہے؟'' میاں نے سر جھکائے جھکائے سوال کیا۔

''صفائی ہو جاتی ہے۔ بدبو نہیں پھیلتی مردہ گوشت کی۔''

''تو بستی والوں سے پوچھو کہ ان کی صفائی کے مزدور کہاں پرواز کر گئے؟ مجھ سے کیوں معلوم کرتے ہو؟'' وہ پھر چپ ہوگئے۔

''میاں!'' میں نے انھیں آواز دی۔

''ہاں۔'' جیسے وہ نیند سے چونکے ہوں۔

''میاں بستی میں کون جواب دے گا، یہاں تو سب جاہل ہیں۔''

''جاہل کون ہوتا ہے؟'' میاں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''جو پڑھا لکھا نہ ہو۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ میاں میرا جواب سن کر افسردہ سے ہوگئے۔

''سنو! جاہل وہ نہیں ہوتا جو حرف شناس نہ ہو۔ جاہل وہ ہے جو حق شناس نہ ہو۔'' انھوں نے رک رک کر بات پوری کی۔

اس مختصر سے جملے کا ایک ایک لفظ شمع بن کر دیر تک میری آنکھوں کے سامنے چمکتا رہا اور میں اس روشنی میں دیر تک نہاتا رہا۔

''اکرم۔ یہاں کچھ دن قیام کرو۔ حرف شناسوں سے بھی پوچھو، حق شناسوں سے بھی معلوم کرو۔ زمین کے رازوں کے پردے زمین پر ہی اٹھائے جاتے ہیں۔ جاننے کے عمل میں کوتاہی کرو گے تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا سوائے رنج رائیگاں۔''

ماحول بہت بوجھل اور سنجیدہ ہوگیا تھا۔ تب میاں نے مجھے ایک پرانی بات یاد دلائی۔

''تمھارے باپ تمھیں بیعت کرانے لائے تھے اور تم میرا ہاتھ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے یاد ہے؟''

ابا روز روز کی شرارتوں سے تنگ آ کر ایک دن مجھے عصر کے بعد میاں کے اسی حجرے میں لائے تھے اور میاں سے بولے تھے:

''اس ناہنجار کو آج ہی اپنا مرید کر لیجیے۔ پڑھنے میں اس کا دل نہیں لگتا۔ گھر کے کام میں ہاتھ نہیں بٹاتا۔ بس شکار شکار۔''

www.taemeernews.com

میاں نے غور سے میری شرارتی آنکھوں میں دیکھا تھا اور اپنے نزدیک بلایا تھا۔ میں کرتا پاجامہ پہنے ٹوپی لگائے آیا تھا۔ میاں نے ایک ڈبے سے ایک روپے کے دو سکے نکالے تھے اور اپنے ایک مرید کو دے کر شیرینی لانے کو کہا تھا۔ جب شیرینی آئی تب میاں نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں مصافحے کے انداز میں تھامے تھے۔ مجھے اس وقت ایسا لگا تھا جیسے دو پہاڑوں کے درمیان میرے ہاتھ ہیں۔ تب میاں نے کلمہ پڑھایا۔ درود شریف پڑھایا۔ ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصل عربی میں پڑھایا۔ پھر اس کا ترجمہ اردو میں پڑھایا، پھر بولے تھے۔

''سلسلہ قادریہ میں بیعت ہو گا کہ سلسلہ چشتیہ میں؟''

میں ہکا بکا ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

''پریشان مت ہو۔ قادریہ سلسلے میں پابندیاں زیادہ ہیں مگر وعدے بھی زیادہ ہیں۔ چشتیہ میں تھوڑی تھوڑی ہندوستانیت ہے۔ سماع سننے کی آزادی رہے گی۔''

''قوالی؟'' میں بول پڑا۔

''قوالی مگر بغیر باجے کے۔''

ابا اتنی دیر تک مجھے خونخوار نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔

''میاں مجھے دونوں سلسلوں میں بیعت کر لیجئے۔''

''بیعت لینے آیا ہے کہ خلافت۔ بیعت ایک ہی سلسلے میں ہوا جاتا ہے۔''

''نہیں میں بیعت نہیں ہوں گا۔'' میں ہاتھ چھڑا کر بھاگا تھا۔ میاں کو میں نے پہلی بار ہنستے ہوئے سنا تھا۔ انھوں نے اپنی منگائی ہوئی شیرینی فاتحہ کر کے تقسیم کرا دی تھی۔ تھوڑی سی ابا کے ہاتھ گھر بھی بھیجی تھی۔

ابا نے گھر آ کر بید نکال کر چار پانچ رسید کئے۔ جب میں روتے روتے بے حال ہو گیا تو میاں کی دی ہوئی شیرینی لے کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے تھے پھر بولے تھے۔

''میاں نے کہا ہے ہم نے تمھارے بیٹے کو ایک اور سلسلے میں بیعت کر لیا ہے۔ لیکن اس کا نام نہیں بتائیں گے۔ اسی لئے انھوں نے شیرینی واپس نہیں کرائی۔ تقسیم کر دی۔'' میں نے جلدی جلدی بتاشے کھانا شروع کر دیے تھے۔

میں بچپن سے واپس آ گیا۔

''میاں اس دن آپ نے مجھے کون سے سلسلے میں بیعت کیا تھا؟''

''تمھیں اس دن سلسلۂ نفس میں بیعت کیا تھا۔ چاہا تھا کہ تمھارا نفس خرید لیں اور تمھیں بیعت دے دیں۔ خدا جانے تم نے اب تک اپنا نفس اپنے پاس ہی رکھا ہے کہ...''

مجھے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ یوں بھی تصوف کی ان اصطلاحات کے واضح معنی میں سمجھ نہیں پاتا تھا۔

''میاں گدھ والے معاملے میں آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔'' میں نے چلتے چلتے میاں کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا۔

اگست ۲۰۰۳/۷/۲۷

''جاؤ حرف شناسوں سے ملو اور حق شناسوں سے بھی۔ اللہ کامیاب کرے گا۔''

یہ جملے کہہ کر انھوں نے استغراق کے ساتھ اپنا سر اپنے گریبان پر جھکا لیا۔

ہم دونوں خاموشی سے الٹے قدم واپس ہو لیے۔

جب میں حبیب کے گھر داخل ہو رہا تھا تو راحت غالباً سو چکا تھا اور سلطانہ آنگن میں کھڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ وہ نہا دھو کر بالوں میں تیل لگا کر ہلکی پھلکی لگ رہی تھی۔ مدھم چاندنی میں بھی اس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح روشن تھیں اور اسی وقت میں نے سوچا کہ میں نے اپنا نفس مرشد کے سپرد کر دیا تھا کہ ابھی بھی وہ میرے ساتھ ہے۔

دفترِ کرگساں

شیخ صاحب نے ہم لوگوں کو صبح ناشتے پر بلایا۔ لکھوری اینٹ کی بے رنگ حویلی کے شکستہ بے رنگ درواز ے کھولنے والے وہ خود تھے۔ ڈیوڑھی میں داخل ہو کر دائیں طرف تین سیڑھیوں کی اونچائی پر دیوان خانے میں آ کر میں نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی مہمان عرصے سے نہیں آیا ہوگا۔ ہال میں ایک بے رنگ دری پڑی تھی اور اس پر ایک دیوان رکھا ہوا تھا۔ ہم تینوں کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ اندر بیگم صاحبہ بوا کو انڈے ابالنے کی ہدایت دے رہی تھیں۔ شیخ صاحب کرتا پاجامہ اور صدری پہنے ہوئے تھے۔ سر پہ مزدوروں کی طرح مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ یہ انسان میرے بچپن کے شیخ صاحب سے کتنا مختلف ہے۔

''آپ کب آئے؟'' انھوں نے میری طرف جلیبیاں بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کل ہی۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔ میں ان سے کبھی بھی بے محابا نہیں تھا۔

''حبیب نے مجھے بتایا کہ آپ اس معاملے کی بات کر رہے ہیں کہ ہمارے شیشم کے جنگل کے گدھ کہاں چلے گئے۔ ہم خود بہت الجھن میں ہیں۔ وہ تالاب بھی ہمارا ہی ہے جس کے کنارے مردہ مویشی برسہا برس سے ڈالے جاتے رہے ہیں۔ ان کے تعفن سے پوری آبادی پریشان ہو جاتی ہے اور مجھے خواہ مخواہ شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے کیوں کہ بہر حال وہ میری ہی زمین پر ڈالے جاتے ہیں۔ گدھ جب تک تھے ان مویشیوں کے بدن ایک ہی دن میں، متعفن ہونے سے پہلے صاف ہو جاتے تھے۔ اب کئی کئی دن تک جانور پڑے رہتے ہیں۔ کوئی دھیرے دھیرے ان کو صاف کرتا ہے۔ سخت بدبو آتی ہے۔ ہوا چلتی ہے تو اور قیامت برپا ہوتی ہے۔ مردہ گوشت میں جراثیم بہت تیزی سے پھیلتے ہیں۔ بیماریوں کا سخت اندیشہ رہتا ہے۔ سمجھ کچھ کام نہیں کرتی کہ گدھ کہاں چلے گئے۔''

www.taemeernews.com

وہ تفصیل سے اپنے تاثرات بتا رہے تھے۔

میں نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''شیخ صاحب! کیا اس سے پہلے بھی گدھ کبھی غائب ہوئے تھے؟''

یہ سوال سن کر وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ دیر تک کچھ سوچتے رہے۔

''ابھی آتا ہوں۔'' کہہ کر اندر گئے۔ بہت دیر تک ملحقہ کمرے میں کاغذات کی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔ پھر وہ ہاتھ میں ایک شکستہ فائل لے کر برآمد ہوئے۔ انھوں نے بھدی میلی ڈوریوں سے بندھی ہوئی وہ کرم خوردہ فائل میرے سامنے رکھ دی۔ اس پر خطِ شکستہ میں لکھا تھا:

دفتر کرگسان بھلاؤ پوکھر

''آپ اسے پڑھ لیجئے۔ شاید اس میں کوئی سراغ مل سکے۔''

''اپنے گھر کے قدیم کاغذات اغیار کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے؟''

اندر سے بیگم صاحبہ کی دھیمی دھیمی بڑبڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی جسے سن کر شیخ صاحب شرمندہ نہیں ہوئے، صرف دھیمے سے مسکرا دیئے۔

''بیگم صاحبہ کو ابھی بھی یہی لگتا ہے کہ ہر قدیم کاغذ کسی آراضی کا بیع نامہ ہے۔''

میں نے احتیاط سے ڈوریاں کھولیں۔ فائل کے کور پر مٹی مٹی سیاہ روشنائی میں تاریخ وار کچھ اندراجات تھے لیکن وہ اتنی زیادہ شکستہ تحریر میں تھے کہ مجھے پڑھنے میں الجھن ہو رہی تھی۔ البتہ فائل کا پہلا صفحہ دلچسپ تھا۔

یہ ایک خط نما عرض داشت تھی جو حاکمِ ضلع کو لکھی گئی تھی۔ عیسوی سنہ اور تاریخ کے ساتھ مطابقت کرتی ہوئی ہجری تاریخ اور سنہ بھی خط کی پیشانی پر درج تھا۔

''بخدمت حضور فیض گنجور فیض رساں حاکم ضلع صاحب بہادر،

''بعد آداب عاجزانہ و دعاہاے ترقی حکومتِ وقت آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ میرے ربِ مجازی شیخ نسیم احمد زمین دار احمد نگر بمعوئی و موضع ثبادگنج کے پچاس بیگھے کے قطعہ باغ انبہ قلمی کے درختوں کو کرگسان ناہنجار نے اپنی سکونت بنا رکھا ہے۔ بھاری بدن کا پرند ہونے کے سبب یہ ہمارے درختوں کی شاداب ڈالیاں توڑ دیتے ہیں اور بور کے موسم میں بور جھڑنے کا سبب بھی یہی پرندے ہوتے ہیں۔ اس نقصان پر مستزاد یہ کہ ان کی شب و روز موجودگی کی وجہ سے درخت اور باغ میں بے تحاشہ غلاظت پھیل جاتی ہے جس کو دیکھ کر سخت کوفت اور نقصان کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے آسامی مستقل شکایت کرتے ہیں۔ آج بدرجہ مجبوری آپ کو تکلیف دی جا رہی ہے کہ متعلقہ محکمے کو احکامات جاری فرما دیں ہمارے باغ سے ان کرگسوں کی سکونت ختم کی جائے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب شہری انتظامیہ کو آپ کے اعلیٰ دفتر سے حکم جاری ہو کہ مردہ مویشی ہمارے آم کے باغات کے پاس نہ ڈالے جائیں۔

''فدوی اس احسان کو تا زندگی فراموش نہ کرے گا اور آپ کے واسطے ہمیشہ دعا گو رہے گا۔

''عرضی گزار منشی طاہر حسین
مختار عام شیخ نسیم احمد صاحب رئیس قصبہ۔''

دوسرا خط تین مہینے بعد کی تاریخ کا تھا۔

القاب و آداب تقریباً وہی تھے۔ مضمون تھا۔

''مردہ مویشیوں کے ڈالنے کی جگہ آپ کے احکامات کے تحت بدل دی گئی جس کے لئے عرضی گزار بہت ممنون ہے۔ لیکن مویشی ڈالنے کی نئی جگہ ہمارے اس قطعہ زمین سے ملحق ہے جہاں مالکِ زمین کے جدِ امجد نے شیشم کا جنگل لگایا تھا اور جس کے درخت اب جوان ہو کر سرو قد ہو چکے ہیں۔ یہاں بور جھڑنے کا کوئی خطرہ تو نہیں ہے لیکن گدھوں کے بیٹھنے سے نحوست کا احساس ہوتا ہے اور درختوں کے دیکھنے سے وہ فرحت نہیں حاصل ہو پاتی جو عام طور پر بلند درختوں کے پاس کھڑے ہو کر تنے سے لے کر چوٹی تک درخت کو دیکھنے سے آنکھوں اور دلوں میں بھر جاتی ہے۔ مزید برآں یہ کہ کرگسوں کے بد صورت بچے بہت دن میں بالغ ہو پاتے ہیں۔ دن رات کریہہ آواز میں چیں چیں کرتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت ان آوازوں میں ایک آسیبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے شیشموں کا باغبان رات کو وہاں سونے میں ڈر محسوس کرتا ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں کرگسون کی سکونت کی وجہ سے کہیں یہ قطعہ شیشم ''گدھوں والی بغیا'' کے نام سے نہ مشہور ہو جائے۔ اس منحوس لقب کی وجہ سے گمان غالب ہے کہ شیشم کا یہ جنگل اپنی عمرِ طبعی پر پہنچ کر ہم کو وہ فائدہ نہیں دے سکے گا جو عام حالات میں دیتا۔

''برائے کرم متعلقہ محکموں کو احکامات صادر فرما کر مستقل سدِ باب کیا جائے تو یہ بندۂ عاصی تا زندگی ممنون رہے گا اور حاکم و حکومت کے واسطے دعا کرے گا۔

''عرضی گزار منشی طاہر حسین
مختار عام شیخ نسیم احمد صاحب رئیس قصبہ۔''

اس عرضی کے بعد جو سرکاری احکامات تھے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ حاکم نے مدعا تسلیم نہیں کیا اور اسے محض سرسری بے بنیاد شکایت بتا کر داخل دفتر کرتے ہوئے یہ حکم بھی جاری کیا کہ گدھوں کو بمشکل آم کے درختوں سے شیشم کے جنگل کے درختوں تک راغب کیا گیا۔ اب مالک قطعہ زمین کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ ان کی سکونت میں حارج نہ ہوں کہ ایسا کرنے سے مردہ مویشیوں کی صفائی کے جو مسائل پیدا ہوں گے اس کی ذمہ داری براہ راست مالک قطعہ زمین پر ہوگی اور مناسب اور فوری قانونی کاروائی کی جائے گی۔

اس حکم نامے کی ایک کاپی کوتوال شہر اور دوسری شہری انتظامیہ کے سکریٹری کے نام تھی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ شیخ صاحب مجھے غور سے امید طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بولے۔

''اس حکم نامے کے بعد ہم لوگ ایک طرح سے گدھوں کی حفاظت

www.taemeernews.com

کے کام میں لگ گئے کیوں کہ خلاف ورزی کرنے پر زمین داری کے معاملات میں حاکم کے جا و بے جا دخل درمعقولات کا شدید خطرہ تھا کیوں کہ حکم نامہ تحریری تھا اور اس کی سرکاری کاپی پولس کے محکمے اور میونسپل بورڈ کو بھی دی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مردہ مویشی بھی ہمارے ہی تالاب کی سوکھی جگہ پر ڈالے جاتے رہے اور گدھوں کا مستقل قیام ہماری ہی زمین یعنی شیشم کے باغ میں ہوگیا۔ مدتوں بعد یہ سوچ کر کہ یہ حاکم بدل گیا ہے جب بھی نئے سرے سے شکایت کی، اوپر سے اس حکم نامے کا حوالہ دے کر حکم دیا جاتا رہا کہ سابقہ احکامات کی خلاف ورزی نہ ہو۔''

یہ بات مکمل کر کے وہ ایک ٹھنڈی سی سانس لے کر رکے اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی جیسے یہ سب کچھ بتا کر دل کی بھڑاس نکال لی ہو۔ میں نے فائل آگے پڑھنا شروع کی۔ اس میں اب صرف ایک ہی عرضی لگی تھی جو بالکل تازہ تھی اور رائج سرکاری زبان میں تحریر تھی۔

''یہ عرضی لالہ اگروال نے حال میں دی ہے'' شیخ صاحب آہستہ سے بولے۔

یہ عرضی کسی معمولی وکیل نے لالہ اگروال کی طرف سے ڈرافٹ کی تھی۔

''شری مان ضلع دھیش مہودے۔

''آپ کو اور حاکم پرگنہ کو اس سے پہلے بھی سوچنا دی جا چکی ہے لیکن ابھی تک کوئی مناسب کارروائی نہیں ہوسکی ہے۔ مجبوراً یہ ریمائنڈر دیا جا رہا ہے۔

''شیشم کے درختوں پر گدھوں کے رہنے اور تالاب کی سوکھی زمین پر مردہ ڈھور ڈنگر ڈالنے کے حکم نامے کی متعلقہ پارٹی کی طرف سے خلاف ورزی نہیں ہوئی اور سارا کام برسوں سے سچاروروپ سے چلتا رہا۔ مگر پچھلے دنوں اچانک ہماری بستی سے گدھ غائب ہوگئے۔ اب مردہ مویشی کئی کئی دن تک یونہی پڑے رہتے ہیں۔ اس سے کئی طرح کے نقصانات پبلک کو ہو رہے ہیں۔

۱- ہوا کے ساتھ مویشیوں کے سڑے ہوئے گوشت کی بدبو آتی ہے اور پبلک ادھر منھ کر کے سانس بھی نہیں لے سکتی۔

۲- سڑے ہوئے گوشت میں جراثیم بہت تیزی سے پیدا ہوتے ہیں جن کے کارن بستی میں ایسی ایسی بیماریاں پیدا ہونے کا خطرہ ہے جس کا علاج مقامی ڈاکٹر نہیں جانتا۔ اس بارے میں مقامی ڈاکٹر کی رپورٹ بھی لی جا سکتی ہے۔

۳- گوشت نہ کھانے والی پبلک بدبو سے زیادہ پریشان ہے اور انھیں بیماریوں کا ادھک خطرہ ہے۔

۴- مقامی کاشتکاروں کے ساتھ ہم نے پورے علاقہ کا کونہ کونہ چھان مارا، ایک گدھ بھی نظر نہیں آیا۔ مردہ مویشیوں کو ڈالنے کی کوئی اور جگہ بھی اب نہیں بچی ہے۔ اس لئے بنتی ہے کہ اوپر لکھی شکایتوں کا ترنت پربندھ کیا جائے۔ اگر سمبھو ہو تو چڑیا گھروں سے گدھ کے بچے دلوا دیئے جائیں۔ ہم ان کو اپنے گھروں میں گھریلو پرندوں کی طرح پال پوس کر شیشموں کے اوپر رہنا سکھا دیں گے۔''

درخواست کی اس فوٹو کاپی پر مصدقہ کاپی کی مہر لگی تھی۔

درخواست کے حاشیے پر حاکم پرگنہ کا نوٹ تھا۔

''شیشم کا جنگل سوکھ گیا ہے اس لئے اب وہاں گدھ کا پالن پوشن ممکن نہیں ہے۔ درخواست داخل دفتر کی جا سکتی ہے۔''

اس کے نیچے حاکم ضلع کا مختصر آرڈر تھا۔

''داخل دفتر۔'' اس کے نیچے حاکم ضلع کے دستخطوں کی چڑیا تھی جو لگ بھگ گدھ کی شکل سے مشابہ تھی۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔

''شیخ صاحب! اگر شیشم کا جنگل نہ بھی سوکھتا تب بھی یہ نوبت آنا ضروری تھی کیوں کہ دوسرے درختوں پر سکونت کرنے کے لئے گدھوں کا ہونا ضروری ہے اور یہاں اب ایک بھی گدھ نہیں بچا۔''

''پھر؟'' شیخ صاحب کھوئی کھوئی آنکھوں سے ہم دونوں کو دیکھتے رہے۔

''مطلب یہ کہ صرف شیشم کے جنگل کا سوکھنا ہی اہم بات نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ گدھ کہاں چلے گئے؟ اگر وہ ہوتے تو سڑک پار کے آموں کے درختوں پر بھی بسیرا کر سکتے تھے۔''

''ایک ہی آم کے درخت پر سو دو سو گدھ آرام سے رہ سکتے ہیں۔'' حبیب نے دل ہی دل میں آم کی موٹی شاخوں کا حساب لگا کر اپنے لکڑی کے کاروبار کے علم سے ہمیں مستفیض کیا۔

''یعنی شیخ صاحب اصلی مسئلہ شیشم کا جنگل سوکھنا نہیں، بلکہ اصلی مسئلہ گدھوں کا غائب ہونا ہے۔ مگر آپ اس معاملے میں اتنے رنجیدہ کیوں نظر آتے ہیں؟'' میں نے ان سے ہمدردی کرنا چاہی۔

''رنجیدہ ہونے کی تو بات ہی ہے۔ مردہ مویشی بھی تو ہماری ہی جگہ پر پڑے رہتے ہیں۔ سڑتے رہتے ہیں۔ تعفن پیدا کرتے ہیں۔ بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ اس کا براہ راست گناہ بھی تو ہم پر ہی پڑتا ہوگا۔''

''مگر اس میں آپ کا کیا قصور'' میں نے انھیں ڈھارس دی۔ وہ سر جھکا کر عاجزانہ انداز میں بیٹھے رہے۔

'' گدھ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوتا۔ وہ ماحول سے لڑنے کے معاملے میں بڑی قوتوں کا مالک ہے۔'' میں نے علم حیوانات کا ایک اصول بتایا۔

تب انھوں نے مفلر اتارا اور میں نے دیکھا کہ ان کے سر پر بہت کم بال رہ گئے تھے۔ تقریباً پورا سر گنجا ہو گیا تھا۔

''شیخ صاحب، تالاب اور اس سے ملحقہ سوکھی زمین بھی آپ ہی کی ہے؟''

''جی ہاں۔ نا تمہ زمین داری ایکٹ میں اس کی صراحت تھی کہ گاؤں کے کنوئیں اور تالاب اور ان تالابوں کے سوکھنے کے بعد حاصل کی ہوئی زمین پر زمین دار کا قبضہ مالکانہ رہے گا لیکن دوسرے لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔''

''اور بھاؤ پوکھر کے پاس والا بڑا ایلا؟''

www.taemeernews.com

"وہ بھی تالاب کی زمین کا ہی ایک حصہ تصور ہوتا ہے۔"

پھر شیخ صاحب حویلی میں گئے اور اپنے ہتھیار بااصرار دکھانے کے لئے لائے۔ 375 میگنم۔ 460 بور کا رائفل اور گریز کی ۱۲ بور۔

"اگر آپ چاہیں تو ان میں کوئی ہتھیار قبول کر لیں" شیخ صاحب نے بہت عاجزانہ طور پر فرمائش کی۔

"شکار تو یوں بھی قانوناً بند ہو چکا ہے۔ میرے اب یہ کس کام کے ہیں۔"

ان کی آنکھوں میں شفیق سی فرمائش تھی لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔ میاں سنتے تو کیا سوچتے کہ میں نے اپنا نفس کس کس کے حوالے کر رکھا ہے۔

میرے انکار پر وہ چپ رہے پھر ایسے بولے جیسے مجھ سے نہیں کسی اور سے کہہ رہے ہوں۔

"زمینداری کے بعد زمینیں نکل گئیں۔ سیر کی جو زمینیں تھیں وہ بے ایمان ملازموں نے اونے پونے ہمارے دستخط کرا کے بیچ ڈالیں۔ بانڈ کی آمدنی ختم ہوئے عرصہ ہوا۔ اس حویلی کی مرمت تک نہیں کرا سکتا۔ کسی کسی دن تو ایسا لگتا ہے کہ اگلے مہینے گھر کی بوا کی تنخواہ کیسے ادا ہوگی۔"

"پر اب تو شیشم کے جنگل سے خوب آمدنی ہوئی ہوگی؟" حبیب بڑی حسرت کے ساتھ بولا۔ لکڑی کا کوئی سودا ہو، کسی سے سودا ہو، وہ ہمیشہ خود کو ہاری ہوئی پارٹی مانتا تھا۔

"ہاں... اس میں بھی تیس چالیس فیصد پولیس والے اور جنگل والے لے گئے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جب ہم ان کے یہاں سے نکلے تو وہ ہمیں چھوڑنے باہری دروازے تک آئے۔ باہری دروازے کے عین مقابل سردیوں کی سہ پہر کا سورج چمک رہا تھا لیکن اس کی چمک آنکھوں کو بری نہیں لگ رہی تھی۔

تب مجھے ایک پرانی بات یاد آئی۔

"شیخ صاحب! کیا بھاؤ پوکھرے کے تالاب میں کوئی بھوت پریت ہے؟"

وہ بوسیدہ دروازہ پکڑے کھڑے تھے۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر اچانک دروازے سے خود کو الگ کیا اور ہم لوگوں کے قریب آ کر بہت اعتماد کے ساتھ بولے۔

"یہ سچ ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے۔ حضرت میاں کے نانا حضرت حاجی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وقت تھا۔ شہر میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ درگاہ کے پاس ایک پیپل کے درخت پر الّو بولا۔ حاجی میاں صاحب کو اس کی آواز پر شبہ ہوا۔ اسی دن قصبے میں کئی موتیں ہوئی تھیں۔ حال یہ تھا کہ کوئی کوئی جنازہ تو ایسا ہوتا تھا جس کے ساتھ کندھا دینے والے چار افراد بھی نہیں ہوتے تھے۔ وہ بندوق لے کر باہر نکلے۔ بہت ولی صفت اور جری انسان تھے۔ پیپل کے پاس گئے۔ بندوق چھتیائی تو وہ طائر اڑ کر برابر کے نیم پر بیٹھ گیا۔ وہاں گئے تو وہ بھاؤ پوکھر کی طرف اڑا اور ایک پرانے برگد پر بیٹھ کر شور مچانے لگا۔ حاجی میاں تالاب تک پہنچ گئے۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ رات خاصی بیت چکی تھی۔ حاجی میاں صاحب برگد کے بڑے درخت کے نیچے کھڑے بندوق چھتیائے اسے دیکھتے رہے۔ اچانک وہ نظر آ گیا۔ وہ فائر کرنا ہی چاہتے تھے کہ وہ انسانی آواز میں منمنا کر بولا۔

"درگاہ والے خاندان کے نہ ہوتے تو ابھی بھاؤ پوکھرے میں الٹا گاڑ دیتا۔"

حاجی میاں صاحب نے آیت الکرسی کا ورد با آواز بلند کیا تو وہ چیختا ہوا پوکھر میں ڈبکی لگا گیا۔ اب بھی کبھی کبھی کسی درخت پر بول جاتا ہے۔"

مجھے اپنے بدن میں سنسنی سی محسوس ہوئی۔

"شیخ صاحب کیا آپ نے یہ واقعہ خود حاجی میاں صاحب سے سنا تھا؟" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ جب ان کا وصال ہوا، میں چھوٹا تھا۔ یہ واقعہ میں نے اپنے والد سے سنا تھا۔"

"کیا کوئی ایسا ہے جس نے خود حاجی میاں صاحب سے یہ واقعہ سنا ہو؟"

"آپ حضرت میاں سے معلوم کر لیں۔ وہ شاید کچھ بتا سکیں۔"

ہم دونوں ان سے رخصت ہو لئے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ مفلر باندھتے ہوئے باہری دروازے سے ڈیوڑھی میں اور وہاں سے سیڑھیاں چڑھ کر دیوان خانے میں داخل ہو رہے تھے، ڈبکی لگا رہے تھے، غائب ہو رہے تھے

☆☆☆

عروض، آہنگ اور بیان

از شمس الرحمٰن فاروقی

پہلے ایڈیشن کے چند نسخے اتفاقاً دستیاب ہو گئے ہیں۔

قیمت : پچھتر روپے

شب خون کتاب گھر

سے رجوع فرمائیں

www.taemeernews.com

پاک ناموں والا پتھر

نیر مسعود

[پاک ناموں والا پتھر بیضوی قطع کی ایک سفیدی مائل لوح کی شکل میں ہے جس پر باریک حرفوں میں پاک نام کندہ ہیں۔ ایک نظر دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ کبھی اس کا رنگ خالص سفید رہا ہوگا، لیکن اب یہ بتانا ممکن نہیں کہ اس میں اور کس رنگ یا کن کن رنگوں کی آمیزش ہو چکی ہے۔ پتھر نیم شفاف ہے اور روشنی کے رخ کر کے دیکھنے سے اس پر کھدے ہوئے پاک نام صاف پڑھنے میں آتے ہیں۔ اس میں سے اس پار کی چیزیں بھی دھندلی دھندلی دکھائی دیتی ہیں، البتہ ان کی جسامت میں فرق آجاتا ہے اور پتھر کے رخ میں ہلکی سی تبدیلی کے ساتھ چیزوں کی جسامت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس طرح دیکھنے سے اس پار کی چیزوں پر پاک نام لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

یہ ہمارے خاندان کا نشان ہے، لیکن کئی پشتوں سے غائب تھا۔ میرے ان پڑھ باپ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ہمارے خاندان کا کوئی نشان ہے جو اب بھی گھر میں کہیں موجود ہے]۔

(۱)

باپ کے مرنے کے بعد کئی مہینے تک میں اپنے مکان کے بیرونی حصوں کو کرائے پر اٹھاتا رہا۔ یہ بیرونی حصے مکان میں داخلے کی ڈیوڑھی کے دونوں طرف بنے ہوئے حجروں کی شکل کے تھے۔ داہنے بائیں چھ چھ خاصے کشادہ حجرے تھے جن میں دروازے نہیں تھے۔ یہ آسانی سے کرائے پر اٹھ گئے اور دکان داروں نے ان میں دروازے لگوا کر دکانیں کھول لیں۔ اس طرح میری آمدنی کا مستقل ذریعہ پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد میں مکان کے اندر کے سامان کی طرف متوجہ ہوا۔

زنگ آلود کنجیوں سے زنگ آلود قفلوں کے کھولنے میں مجھ کو دقت ہوئی۔ کوئی کوئی کنجی تو زنگ ہی کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور مجھے اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر اسے گھمانے کے لیے زور لگاؤں گا تو وہ ٹوٹ کر قفل میں پھنسی رہ جائے گی۔ لیکن آخرکار کسی طرح سب دروازوں کے قفل کھل گئے۔ ان کے پیچھے کوٹھریاں، کمرے اور چھوٹے چھوٹے گودام تھے جن میں پرانا سامان کباڑ کی طرح بھرا ہوا تھا۔ میں نے سامان کو سرسری دیکھا۔ اس میں میرے کام کی چیزیں بہت کم تھیں۔ لکڑی، شیشے اور دھاتوں کی بنی ہوئی روزمرہ کے استعمال کی اور آرائشی چیزیں زیادہ تھیں جو تھوڑی بہت ٹوٹ پھوٹ یا محض پرانی ہو جانے کی وجہ سے الگ کر دی گئی تھیں۔

ریشمی کپڑوں کے ملبوسات بھی تھے جن کو دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ مختلف زمانوں کے لباس ہیں۔ ان میں بعض بہت کم یا بالکل نہیں پہنے گئے تھے کہ شاید ان کا چلن ختم ہو گیا، یا ان کا پہننے والا ختم ہو گیا اور وہ لکڑی کے صندوقوں میں گودڑ کی طرح بھر دیے گئے۔

صبح سے تیسرے پہر تک میں نے یہ سارا سامان دیکھ ڈالا۔ ساری کنجیاں قفلوں میں لگ چکی تھیں۔ لیکن جب میں گرد میں اٹا ہوا دالان میں آیا تو میں نے دیکھا کہ میرے پاس ایک کنجی ابھی باقی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کنجی کہاں کی ہے اس لیے کہ میری دانست میں اب مکان کا کوئی دروازہ مقفل نہیں رہ گیا تھا، تاہم میں نے ایک بار پھر سب دروازے دیکھے۔ دہرے دالان کی اندرونی دیواروں کے جو دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے ان میں سے ایک بند تھا اور اس میں موٹے کنڈے کا ایک بڑا قفل لٹک رہا تھا۔ تھک جانے کے باوجود میں نے کوشش کر کے اس قفل کو کھول لیا۔ اس بڑی کوٹھری میں پہلے بھی میں آتا جاتا رہا تھا اور اس وقت کوٹھری کے ایک دو مچانوں پر میرے کھیلنے کی چیزیں رہتی تھیں، باقی پوری کوٹھری خالی پڑی رہتی تھی۔ لیکن اب اس کے سب مچانوں پر چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ہی نظر میں مجھ کو اندازہ ہو گیا کہ دوسری کوٹھریوں کے برخلاف یہاں سامان سلیقے اور ترتیب کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ اس میں کئی چیزیں مجھے ایسی نظر آئیں جو میرے باپ نے میرے سامنے بنائی تھیں۔ انھیں دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کوٹھری کا سارا سامان میرے باپ کے ہاتھ کا بنایا ہوا ہے۔ کبھی کبھی وہ دیر تک میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد اچانک ہنس پڑتا تھا۔ مجھے اس کی بچوں کی سی ہنسی یاد آئی، بلکہ میرے کانوں میں اس کے ہنسنے کی آواز بھی آئی۔ اسی وقت میری نظر ایک مچان کے نیچے رکھے ہوئے لکڑی کے صندوق پر پڑی۔ کوٹھری میں اندھیرا پھیل رہا تھا اور میں تھک چکا تھا، لیکن اب یہی ایک صندوق رہ گیا تھا جس کا سامان میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے میں نے اس کا ڈھکنا اوپر اٹھایا۔ اس میں رنگ برنگے کپڑوں کی چھوٹی بڑی کترنیں تھیں جیسی لباس سینے کے بعد بچ رہتی ہیں۔ صندوق میں سیلن دوڑ گئی تھی اور کترنیں برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ میں نے بالکل نیچے تک ٹٹول کر دیکھا لیکن میرے ہاتھ میں صرف کترنیں آئیں۔ میں نے ڈھکنا بند کر دیا اور کوٹھری سے

www.taemeernews.com

باہر نکل آیا۔

اس رات سونے سے پہلے میں دیر تک اپنے باپ کو یاد کرتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی تصویر مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہی ہے۔ اس کا سبب میری سمجھ میں یہی آیا کہ طفولیت کے ان دنوں کے سوا جب وہ مجھے اپنے زانوؤں پر لٹاتا تھا، میں نے کبھی غور سے اور دیر تک اس کے چہرے کو نہیں دیکھا تھا، اس لیے کہ زیادہ تر وہی میرے چہرے کو دیکھتا رہتا اور میری عادت تھی کہ اگر کوئی میری طرف دیکھنے لگتا تو میں اس کی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ میں اپنے باپ کی صورت یاد کرنے کی کوشش کرتا اور ناکام ہوتا رہا، یہاں تک کہ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ اگر اس وقت اچانک وہ میرے سامنے آجائے تو میں اسے پہچان نہ سکوں گا۔

مجھ کو بے چینی محسوس ہوئی اور میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دہرے دالان سے نکل کر صحن میں جمع ملبے کے ڈھیر پر سے ہوتا ہوا میں پچھواڑے کی بے مرمت دیوار تک پہنچ گیا۔ دیوار میں ہلکا سا شگاف تھا جس میں سے آتی ہوئی باہر کی ہوا آڑی لکیر کی طرح میرے چہرے پر لگ رہی تھی۔ میں آدھی رات تک وہیں کھڑا اپنے باپ کی باتیں یاد کرتا رہا۔ پھر مجھے اپنا بوڑھا استاد یاد آیا۔ وہ دیکھنے میں فقیر معلوم ہوتا تھا لیکن مجھے پڑھاتے وقت اس کا چہرہ بدل جاتا تھا۔ مجھے اس بڑی کتاب کے سادہ ورق یاد آئے جن میں سے پر پہلی مرتبہ استاد کے ہاتھ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کچھ لکھوایا تھا۔ مجھے وہ بڑی بڑی کتابیں یاد آئیں جو میرے اسلاف نے لکھی تھیں اور میں نے ان کو نہیں پڑھا تھا، حالانکہ اب پڑھ سکتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا باپ چاہتا تھا میں ان کو پڑھوں۔ مجھے اس چیز کا خیال آیا جو میرے خاندان کا نشان تھی۔ میرے باپ نے مجھ سے اسے تلاش کرنے کو کہا تھا لیکن یہ نہیں بتا سکا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ان کتابوں میں بھی ہوگی۔ مجھے استاد کا اس وقت کا چہرہ یاد آیا جب وہ آخری بار مجھ سے ملنے آیا تھا اور میری طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے مجھ سے کسی بات کی توقع کر رہا ہو۔ کس بات کی توقع؟ کہ میں ان کتابوں کو پڑھوں؟ کہ میں اس نشان کو کتابوں میں میں تلاش کروں؟ میں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے خواب آلود ذہن میں یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اسے تلاش کروں گا خواہ اس میں میری عمر تمام ہو جائے۔ اور اچانک مجھ پر تھکن اور نیند کا غلبہ ہوا۔ میں دالان میں زمین پر بچھی ہوئی چٹائی کی طرف بڑھنے لگا اور شاید اس پر لیٹنے سے پہلے ہی سو گیا۔

(۲)

میری آنکھ صدر دروازے پر دستک کی آواز سے کھلی۔ باپ کے مرنے کے بعد سے قریب قریب روز کوئی نہ کوئی میرے مکان پر ضرور آتا تھا۔ کوئی اس کے مرنے کی خبر سن کر افسوس ظاہر کرنے کے لیے آتا، کوئی اس کو پوچھتا ہوا آتا اور مجھ سے اس کے مرنے کی خبر سن کر افسوس ظاہر کرتا ہوا واپس جاتا تھا۔ مجھے دونوں طرح کے لوگوں کا آنا برا لگتا تھا۔ دستک کی یہ آواز بھی بری لگی۔ تاہم میں نے جا کر صدر دروازہ کھولا۔

مفلوک الحال سا آدمی تھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کی صورت مجھے پہچانی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ معما اس نے یہ کہہ کر فوراً ہی حل کر دیا:

"آپ کے استاد کا بیٹا ہوں۔ شریک نام ہے۔"

اس نے جیب سے ایک خط نکال کر مجھے دیا اور ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے خط کی پہلی سطر پر نظر ڈالی اور کہا:

"یہ میرے نام نہیں ہے۔"

"آپ ہی کے پڑھنے کے لیے ہے۔" اس نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

استاد کی تحریر دیکھ کر میری نگاہوں میں اس کی صورت گھومنے لگی۔ شریک واقعی اس سے بہت ملتا تھا۔ اور اس وقت وہ بھی میری طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے مجھ سے کسی بات کی توقع کر رہا ہو۔ مجھے استاد کے ساتھ اپنی بدسلوکیاں یاد آئیں اور اس کے بیٹے کا آنا اچھا معلوم ہوا۔

"میں ان کے آخر وقت میں ان کے پاس نہیں تھا"، اس نے میرے خط پڑھنے کے بیچ ہی میں کہا۔ "انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔"

میں خط پڑھ رہا تھا۔ خط شریک ہی کے نام تھا۔ زبان پرانے انداز کی تھی۔ مجھے اس میں شک تھا کہ شریک اس خط کا مطلب ٹھیک ٹھیک سمجھا ہو۔ میں نے اس سے پوچھا:

"تم کیا کام کرتے ہو؟" اور خط تہ کر کے اسے دے دیا۔

وہ کسی خیال میں گم ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا اور اس نے جواب دیا:

"پرانی چیزوں کا بیوپار۔ کوئی اور کام بھی کر سکتا ہوں۔"

"کام چھوڑ کیوں دیا؟"

"انھوں نے منع کر دیا تھا۔"

"استاد نے؟ کیوں؟"

"بے ایمانی... ان کا کہنا تھا کہ میں بیوپار میں بے ایمانی کرتا ہوں۔ حالانکہ... لوگ مجھے اپنے یہاں کا سامان بیچنے کو دیتے تھے اور اندازے سے اس کی قیمت بتا دیتے تھے۔ یہ بھی بتا دیتے تھے کہ اس سے کم پر نہ بیچنا۔ میں زیادہ قیمت پر بیچتا اور ان کے بتائے ہوئے پیسے ان کے حوالے کر دیتا۔ وہ خوشی خوشی میرا حصہ مجھے دے دیتے۔ لیکن ابا کو یہ بے ایمانی معلوم ہوتی اور انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔"

استاد نے خط میں لکھا تھا کہ اگر وہ نئے سرے سے کام شروع کرنا چاہے تو میں اس کو ہر ممکن مدد دوں گا مگر شرط یہ ہے کہ کام میں بے ایمانی نہ ہو۔

میں نے شریک کو دو دن کے بعد بلایا اور اس کے جانے کے بعد خود کو کتابوں والے کمرے میں بند کر لیا۔

کتابوں میں زیادہ تر میرے اسلاف کی لکھی ہوئی تھیں۔ انھیں میں نے الگ کر لیا، بلکہ وہ الگ ہی رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ جو کتابیں تھیں وہ زیادہ تر میرے شہر سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں سیاسی اور سماجی تاریخیں بھی تھیں اور صنعت و حرفت کی کتابیں، روزنامچے، خطوط وغیرہ کے مجموعے اور اسی طرح کی اور

www.taemeernews.com

بہت سی کتابیں۔ یہ زیادہ تر قلمی تھیں اور مختلف زبانوں میں لکھی گئی تھیں۔ میں نے ان کو جھاڑ پونچھ کر موضوع کے لحاظ سے الگ الگ رکھا۔ اور اس عرصے میں شریک کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔

دو دن بعد وہ آیا۔ آج وہ قاعدے کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت پرانا چراغ دان تھا جو چراغ لگانے کے قابل نہیں رہ گیا تھا، اس لیے کہ کئی جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے پہلا سوال یہی کیا:

''یہ کیا لیے ہوئے ہو؟''

وہ ہنسنے لگا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس طرح کی کوئی نہ کوئی چیز ہاتھ میں رکھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ بیوپاری بتاتا ہے کہ وہ پرانی چیزوں کا خریدار ہے خواہ وہ کسی کام کی نہ رہ گئی ہوں۔ اس طرح بات آگے بڑھتی ہے اور لوگ اپنے اور دوسروں کے یہاں کی پرانی چیزوں کا پتہ دینے لگتے ہیں۔

''ایسی چیزیں تو خود اس مکان میں بہت ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان کا کیا کروں۔''

''سب بک جائیں گی۔'' شریک نے کہا۔ ''بس دکان ہونا چاہیے، اور چیزوں کو سلیقے سے رکھنا چاہیے۔''

''میں اپنے گھر کا سامان بیچ کر نہیں کھاؤں گا۔ جو چیزیں میرے کام کی نہیں ہیں وہ تم لے لینا۔ پھر ان کا جو جی چاہے کرنا۔''

مکان کے پہلو والا ایک بڑا کمرہ جو نئے بازار کی طرف کھلتا تھا میں نے اسے دکان کے لیے دے دیا۔ کچھ اپنے گھر کی پرانی چیزیں اور کچھ نقد رقم بھی دی۔ اور کچھ دن کے لیے اسے بالکل بھول گیا۔

اس کے بعد میرا قریب قریب سارا وقت کتابوں والے کمرے میں گزرنے لگا۔ میں نے سب سے پہلے اپنے اسلاف کی کتابیں دیکھیں۔ سب نے اپنے اپنے حالات بڑی تفصیل کے ساتھ لکھے تھے۔ یہ اپنے زمانے کے با اثر اور رئیس لوگوں میں تھے، لیکن جب میں نے اپنے شہر کی تاریخ کا مطالعہ کیا تو ان میں سے کسی کا نام مجھے نہیں ملا۔ ان میں کوئی کوئی بہت پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا لیکن شہر کی علمی تاریخوں میں اس کا بھی کہیں نام نہیں تھا۔ میں نے اپنے شہر کے بارے میں بہت پڑھا اور بہت غور سے پڑھا۔ میرے اسلاف کا کہیں، کسی بھی سلسلے میں، ذکر نہیں تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید ان لوگوں نے اپنے اصلی نام استعمال نہیں کیے ہیں، لیکن اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ پھر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ اپنے زمانے میں مشہور تھے، جیسے بہت سے لوگ اپنے زمانے میں مشہور ہوتے ہیں، لیکن ان کے بعد زمانے نے ان کو بھلا دیا، جیسے بہت سے لوگوں کو بھلا دیتا ہے۔ مجھے بہر حال ان کا نام باقی رہنے نہ رہنے کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ مجھے اس نشان کی تلاش تھی جو ہمارے خاندان کی پہچان تھا اور وہ کہیں نہیں مل رہا تھا، کم سے کم ان کتابوں میں نہیں مل رہا تھا۔

(۳)

ایک دن شریک سویرے سویرے میرے پاس آیا۔

''آئیے اپنی دکان تو دیکھ لیجیے۔''

''دکان تمھاری ہے۔ میری کہاں سے ہوگئی؟'' میں نے کہا۔

''آپ ہی کی وجہ سے ہے۔'' اس نے کہا، ''اور ابھی تو اس میں مال بھی آپ ہی کا زیادہ ہے۔''

میں اس کے ساتھ دکان میں گیا اور اسے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ شریک نے اسے بڑے سلیقے سے سجایا تھا۔ اس میں زیادہ تر میرے ہی گھر کا سامان تھا۔ چیزیں جو میرے یہاں کباڑ کی طرح بھری ہوئی تھیں، یہاں ایک ترتیب سے لگی ہوئی تھیں اور ان کو اس طرح سجایا گیا تھا کہ ٹوٹی پھوٹی چیزوں میں بھی ایک حسن نظر آرہا تھا۔ کچھ سامان باہر سے بھی خریدا ہوا تھا۔ اس میں قدیم زمانے کے کپڑے کی کچھ کترنیں بھی تھیں۔ شریک نے بتایا کہ یہ وہ کپڑے ہیں جو اب مدت سے نہیں بنتے اور کپڑوں کے کارخانوں والے ان کے نمونوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔

مجھے وہ لکڑی کا صندوق یاد آیا۔

''ایسی کترنیں میرے پاس بہت ہیں۔ وہ تم کو دے دوں گا،'' میں نے کہا اور دکان سے چلا آیا۔

لکڑی کا صندوق بہت بھاری نہیں تھا۔ میں اسے آسانی سے صحن میں لے آیا۔ دہرے دالان میں بچھی ہوئی چٹائی میں نے صحن میں بچھا دی جہاں اب دھوپ آرہی تھی۔ میں نے صندوق سے کترنیں نکال نکال کر چٹائی پر رکھنا شروع کیں۔ وہ اب بھی مجھے برف کی طرح سرد معلوم ہوئیں۔ باہر دن کی روشنی میں ان کے رنگ چمک اٹھے تھے اور ان کی وضعوں کی باریکیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ میں نے پورا صندوق خالی کر دیا۔ سب سے نیچے کچھ لمبی لمبی کترنیں تھیں جو ایک گولے کی شکل میں لپیٹ دی گئی تھیں۔ میں نے انھیں کھول ڈالا تو پتہ چلا وہ کسی چیز پر لپیٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اس چیز کو دیکھا۔ یہ بدرنگ تانبے کی ایک بیضوی ڈبیا تھی۔ کچھ وقت کے ساتھ میں نے ڈبیا کو کھول لیا۔ اس طرح پاک ناموں والا پتھر میرے قبضے میں آیا۔ لیکن اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہی میرے خاندان کا نشان ہے۔

لیکن ایک دن جب میں ان کتابوں میں اپنے پردادا کا حال پڑھ رہا تھا تو اس میں جائداد کی تقسیم کے ایک تنازعے میں مجھے شبہ ہوا کہ اس پتھر کا ذکر آیا ہے۔ پھر اس سے پہلے کے ایک مقدمے میں بھی، پھر اور کئی جگہ۔ مگر اس کا نام نہیں لکھا جاتا تھا بلکہ اشاروں کنایوں میں اس کا ذکر ہوتا تھا اور یہ ذکر وہاں سے شروع ہو گیا تھا جہاں سے ہمارے خاندان کی تاریخ شروع ہوتی تھی۔ جائداد کے جھگڑے بھی اسی وقت سے شروع ہو گئے تھے۔ ان جھگڑوں میں بعض دفعہ تقسیم اس طرح ہوئی تھی کہ پوری جائداد ایک طرف تھی اور پاک ناموں والا پتھر ایک طرف، پھر بھی ہر فریق پتھر ہی لینا چاہتا تھا۔ اور ان جھگڑوں میں خون ریزیاں بھی ہوئی تھیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہمارا نشان ہے۔ مگر اس کا ذکر میرے پردادا کے ذکر کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ خاندانی تاریخ کا سلسلہ بھی اس کے بعد زیادہ نہیں چلا۔ بس میرے باپ

www.taemeernews.com

کی پیدائش کا حال بیان ہو رہا تھا کہ ایک ناتمام جملے پر تاریخ ختم ہو گئی اور یہ اس سلسلے کی آخری کتاب تھی۔ یہ وہی کتاب تھی جس کے بہت سے ورق سادہ تھے اور ان میں سے ایک پر میرے استاد نے مجھ سے کچھ لکھوا کر میری تعلیم کا آغاز کیا تھا۔

میں نے پاک ناموں والے پتھر کو بہت دیر تک اور بہت غور سے دیکھا۔ اس میں اس کے سوا کوئی خاص بات نظر نہیں آئی کہ وہ بہت پرانا تھا۔ خود پتھر بہت قیمتی نہیں تھا اور پاک ناموں کی لکھاوٹ میں بھی کوئی خاص خوبی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس طرح کے پتھر میں نے بہت دیکھے تھے جو برکت کے لیے گلے میں ڈالے جاتے تھے اور دو تین شریک کی دکان میں بھی تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہمارے خاندان کا نشان کیوں تھا۔ لیکن چونکہ اس میں کسی دھات کا ایک چھوٹا سا کنڈا ابھی لگا ہوا تھا اس لیے میں نے کنڈے میں ڈورا ڈال کر اسے گلے میں پہن لیا اور اسے شریک کو دکھانے کے لیے دکان پر گیا۔

دکان پر شریک تنہا تھا۔ گاہک یوں بھی دکان پر کم آتے تھے۔ اس دن وہ خریداری کر کے آیا تھا۔ ایک میز پر خریدا ہوا مال رکھا تھا۔ مجھ کو وہ محض کباڑ معلوم ہوا۔ شریک نے تپاک سے میرا استقبال کیا اور مجھ کو اپنی خریداری دکھانے لگا۔ کچھ برتن تھے، لیکن زیادہ تر ٹوٹے یا چٹخے ہوئے، البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں وہ بہت قیمتی رہے ہوں گے۔ اب بھی ان کے رنگ چمک رہے تھے اور ان پر بنے ہوئے نقش و نگار کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ لیکن انھی میں ایک آدھی طشتری بھی تھی۔ یہ بدرنگ فیروزی رنگ کی چینی کی تھی اور موٹی موٹی بنی ہوئی تھی۔ میں نے کہا:

"یہ تو اچھی نہیں ہے۔"

"یہ سب سے خاص چیز ہے۔" شریک نے کہا، "یہ غوری کی طشتری ہے۔ اس میں زہر آلود چیز رکھی جائے تو اس کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اگر تیز زہر ہو تو ٹوٹ جاتی ہے۔ ہر گھر میں غوری کا ایک آدھ برتن ضرور ہوتا تھا، اور رکھے رکھے غائب ہو جاتا تھا، پھر آموجود ہوتا تھا۔"

مجھے یقین نہیں آیا لیکن میں کچھ بولا نہیں اور ایک کرسی کا ٹوٹا ہوا ہتھا اٹھا لیا۔ یہ سیاہ لکڑی کا تھا اور اس پر کٹاؤ کا بہت باریک کام بنا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا:

"اسے کون خریدے گا؟"

"ہر مال کا گاہک موجود ہے، ڈھونڈنے والا چاہیے۔" یہ شریک کا پسندیدہ فقرہ تھا۔ "جو اس کا خریدار ہو گا وہ اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت دے گا۔ نہیں تو دکان میں پڑا رہے گا۔ ایک خریدار میرے پاس ہے جو دنیا بھر میں گھومتا ہے اور مُردوں سے متعلق جو جرم کیے جاتے ہیں ان کا سامان جمع کرتا ہے۔"

"مُردوں سے متعلق جرم؟"

"اس نے پانچ چھ سو سال پہلے تک کا سامان جمع کر لیا ہے۔ قبریں کھودنے، لاش کے حصے کاٹنے کے اوزار، اور معلوم نہیں کیا کیا۔ بہت پیسے والا آدمی ہے اور اپنے مطلب کی چیز کی کچھ بھی قیمت دے سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اصلی چیز ہو۔ اور اصلی چیز وہ ایک نظر میں پہچان لیتا ہے۔ اسے کوئی دھوکا نہیں دے سکتا۔ پرانی چیزیں جمع کرنے والے جو اصلی لوگ ہوتے ہیں وہ کبھی دھوکا نہیں کھاتے۔ اب اس کو ایک چیز کی تلاش ہے۔ اس نے یہاں کے کفن چوروں کے بارے میں سنا ہے کہ ان کے پاس کوئی ایسا اوزار ہوتا تھا جس سے وہ قبر کے اندر سے مردے کا کفن نکال لیتے تھے اور انھیں پوری قبر کھودنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ بس قبر کے سرہانے ایک سوراخ کرنا ہوتا تھا جسے کام پورا ہونے پر بند کر دیتے تھے۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ مردہ قبر کے اندر ننگا پڑا ہے۔"

وہ چیز میرے ہاتھ میں رہ چکی تھی۔ میں بچپن میں جس دوسری درس گاہ میں پڑھتا تھا اس سے متصل ایک میدان تھا۔ اس میدان کے ایک سرے پر ایک بہت پرانا مقبرہ اور اس سے متعلق چھوٹا سا قبرستان تھا۔ ایک دن میں درس گاہ پہنچا تو قبرستان میں مجمع لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ کل یہاں ایک میت دفن کی گئی تھی۔ آدھی رات کے وقت کوئی کفن چور میت کا کفن نکال رہا تھا کہ میدان کے کنارے والے ایک مکان میں جاگ ہو گئی اور کفن چور اپنا کام ادھورا چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کفن آدھے کے قریب قبر سے باہر نکلا رہ گیا۔ میں جب پہنچا ہوں تو قبر کھول کر اور مردے کو پھر سے کفنا کر بند کی جا چکی تھی۔ اور وہ اوزار جس سے کفن کھینچا جا رہا تھا ایک کنارے پڑا ہوا تھا۔ یہ لوہے کی ایک نکیلی چھڑ تھی جس کے سرے کے پاس ایک آنکڑا اس طرح لگایا گیا تھا کہ اس نے چھڑ کے ساتھ مل کر ایک چھوٹے چمٹے کی سی شکل بنا دی تھی۔ نوک سے قبر کے سرہانے کی طرف چھید کیا جاتا تھا، پھر قبر کے پٹروں تک پہنچ کر آخری پٹرے کو ابھارا اور اوزار کو میت تک پہنچا دیا جاتا تھا اور آنکڑے کی مدد سے کفن کی بندش کھول لی جاتی تھی۔ پھر چمٹے میں کفن کا ایک سرا پھنسا کر اس کو تین چار مرتبہ گھمایا جاتا یہاں تک کہ کفن کا سرا اس میں اچھی طرح لپٹ جاتا۔ یہ سب کام محض اندازے سے ہوتا تھا اور کفن چور کا اندازہ غلط نہیں ہوتا تھا۔ وہ سرے کو آہستہ آہستہ کھینچ کر قبر سے باہر لے آتا۔ اس کے بعد کا کام آسان تھا۔ کفن کا سرا ہاتھ میں آ جانے کے بعد اس کو تیزی سے کھینچا جاتا۔ قبر میں میت الٹ پلٹ ہوتی رہتی اور اس کا کفن باہر نکلتا رہتا تھا۔ اسی طرح سب پارچے نکال لیے جاتے تھے اور قبر کا چھید مٹی بھر کر بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ تفصیل مجمعے میں سے ایک شخص نے بتائی جو صورت سے خود بھی کفن چور معلوم ہوتا تھا۔ لوگ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک بہت تیز بارش آ گئی۔ کچھ لوگ مقبرے میں گھس گئے اور کچھ ادھر ادھر بھاگے۔ میں نے وہ چھڑ اٹھا لی، بھاگ کر درس گاہ کے اندر آ گیا اور اپنے ساتھیوں کو اس سے ڈراتا رہا۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ میں نے وہ چھڑ کیا کی۔

میں نے شریک کو یہ واقعہ بتایا تو وہ بے چین ہو گیا۔

"آپ کو اس اوزار کی شکل اچھی طرح یاد ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ یاد ہے، مگر یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ کیوں؟"

"پرانے لوہے کی دکانوں پر شاید وہ مل جائے۔ مجھے کاغذ پر اس کی شکل بنا دیجیے گا۔"

اس کے بعد اس نے سبز رنگ کے پتھر کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ یہ بھی کسی ٹوٹی ہوئی چیز کا حصہ تھا۔

"سنگ سماق،" اس نے کہا۔ "یہ اب بھی کہیں کہیں مل جاتا ہے، لیکن سبز سماق بہت نایاب ہے۔"

www.taemeernews.com

تب مجھے اپنے گلے میں پڑا ہوا پاک ناموں والا پتھر یاد آیا۔ میں نے اسے اتار کر شریک کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس نے پتھر کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا، پھر بولا:

"پتھر میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ اب بھی ملتے ہیں۔ تعویذ کے طور پر پہنے جاتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے،" میں نے کہا۔ "لیکن یہ ہمارے خاندان کا نشان کیوں ہے؟"

مگر شریک سے مجھے اس میں کوئی مدد نہیں ملی اور میں نے اسے پھر گلے میں ڈال لیا۔ شریک اپنی خریداری کی چھنٹائی کرنے لگا۔ آج میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ مجھے اپنے استاد کا فقیروں کا سا چہرہ یاد آیا۔ شریک کا جوان چہرہ تھا، لیکن استاد سے اس کی مشابہت حیرت انگیز تھی۔ میرا اس سے باتیں کرنے کو جی چاہنے لگا۔ ابھی تک میں نے اس سے بہت کم گفتگو کی تھی اور مجھے اس کے بارے میں، سوا اس کے کہ وہ استاد کا بیٹا ہے، کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ میں نے اس سے پوچھا:

"تمھیں پرانی چیزوں کے بارے میں اتنی باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟"

"کام کرتے کرتے محاورہ ہو گیا ہے۔ اور... آپ کے استاد بھی جوانی میں یہی کام کرتے تھے۔ پھر چھوڑ دیا۔"

"کیوں چھوڑ دیا؟"

"پرانے مال کی خریداری میں انھیں کہیں سے بہت سی کتابیں ہاتھ لگ گئیں۔ انھیں پڑھنے میں لگے تو انھیں کے ہو رہے۔ ان کا کام میں نے سنبھال لیا۔ انھوں نے مجھ کو بہت کچھ بتایا۔ پھر اور بھی بہت کچھ معلوم ہوا۔ پھر انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا تو میں ایک اور جگہ کام کرنے لگا۔"

"کس جگہ؟"

اس نے نوادر فروشی کی ایک بڑی دکان کا نام لیا جو شہر کے تجارتی علاقے میں تھی۔

"وہاں کام کیوں چھوڑ دیا؟"

"وہ لوگ نئی چیزیں بھی پرانی بنا کر بیچ دیتے ہیں۔ صراحیاں، آب خورے جن پر کائی لگی ہوتی ہے، وہ تک بیچ دیتے ہیں۔"

"لیکن تم تو کہتے ہو پرانی چیزیں جمع کرنے والا کبھی دھوکا نہیں کھاتا۔"

"اصلی آدمی دھوکا نہیں کھاتا۔"

پھر اس نے بتایا کہ اس دکان پر غیر ملکوں کے سیاح بہت آتے ہیں جو یہاں سے پرانے زمانے کی کچھ یادگاریں اپنے وطن لے کے جانا چاہتے ہیں۔ ان میں اکثر بے تمیز ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کوئی بھی چیز جو ذرا سی کہنہ معلوم ہو، پرانے زمانے کی کہہ کر بیچی جا سکتی ہے۔

"میں وہاں کام کرتا تھا کہ ایک دن مجھے ابا کی آواز سنائی دی۔ "تم اب بھی میری روح کو تکلیف پہنچا رہے ہو۔" کسی گھر کا پرانا رہنے والا جب مرجاتا ہے تو کچھ دن تک گھر میں اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ زیادہ تر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے کیا کہا۔ لیکن اس آواز کا ایک ایک لفظ اتنا صاف تھا کہ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ بولنے والا مر چکا ہے۔ لیکن خیر دوسرے ہی دن سے میں نے دکان پر جانا چھوڑ دیا۔ پھر آپ کی مہربانی سے..."

مجھے استاد کا گھر دیکھنے کی خواہش ہوئی جہاں استاد کی آواز آتی تھی۔

"استاد کا گھر کہاں ہے؟"

اس نے پتہ بتا دیا۔ میں نے پوچھا:

"تم بھی اسی گھر میں رہتے ہو؟"

مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ استاد نے شریک کے نام خط میں اس کو ہدایت کی تھی کہ اسی گھر میں چلا آئے۔

"گھر کا ہے کو ہے، بس پڑ رہنے کی جگہ ہے۔ اس لیے آپ کو ابھی تک وہاں نہیں لے گیا۔"

"کسی دن لے چلو"، میں نے کہا۔ "آخر میرے استاد کا گھر ہے۔"

(۴)

دوسرے دن میں شریک کے ساتھ استاد کے گھر گیا۔ بس ایک اندھیری کوٹھری تھی۔ مجھے اس کے سامان میں صرف ایک چٹائی کا اندازہ ہوا، وہ بھی اس لیے کہ شریک نے اسی پر مجھے بٹھایا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا استاد صورت سے جتنا فقیر معلوم ہوتا تھا حقیقت میں اس سے زیادہ فقیر تھا۔ مگر اس کے سینے میں معلومات کا دریا تھا۔ میں نے شریک سے اس کے بارے میں طرح طرح کے سوال کیے لیکن وہ بھی اپنے باپ کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ استاد کے آخر وقت کے بارے میں بھی اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔

"مجھے ان کے کئی دن بعد خبر ہوئی۔"

"کس طرح؟"

"طاہرہ بی بی سے۔"

"طاہرہ بی بی..."

"لیکن طاہرہ بی بی کو میرا پتہ نہیں معلوم تھا۔ کئی دن کی تلاش کے بعد..."

"طاہرہ بی بی کون ہیں؟ مجھے بھی استاد کی خبر انھی نے پہنچوائی تھی۔"

"ابا نے انھیں پڑھایا تھا۔ قریب ہی رہتی ہیں۔ وہی آخر وقت میں ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ مجھ کو ابا کی خدمت کا موقع نہیں ملا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ شریک میرے ساتھ ہی کوٹھری سے باہر نکلا۔ کچھ دیر تک باہر کی تیز دھوپ میں میری آنکھوں نے ٹھیک کام نہیں کیا لیکن میں شریک کا ہاتھ پکڑے ہوئے چلتا رہا۔ میں نے سوچا استاد کے مرنے پر مجھے شریک سے افسوس کا اظہار کرنا چاہیے، لیکن اب یہ بے موقع بات ہوتی، اس لیے چپ چاپ چلتا رہا۔

کچھ دور چلنے کے بعد وہ رکا اور بولا:

"طاہرہ بی بی اسی مکان میں رہتی ہیں۔ ان سے بھی مل لیا جائے؟"

www.taemeernews.com

ہم ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ شریک نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اس مکان میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا اور مجھے مکان کی ڈیوڑھی میں لے گیا۔ ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے پر پڑے ہوئے پردے کے اس طرف ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ پردے کے دوسری طرف مجھے ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔ میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے جواب دینے کے ساتھ ہی پوچھا:

''آپ کو کنجیاں بھجوادی تھیں۔ سب دروازے کھل گئے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔'' بعض قفل ذرا مشکل سے کھلے، مگر کھل گئے۔''

''سامان آپ نے دیکھ لیا؟''

''اکیلے تو شاید نہ دیکھ سکتا، لیکن شریک کی وجہ سے...''

''تریک...؟''

''ہم کو کہہ رہے ہیں۔'' شریک نے اسے بتایا۔

''تمھارا نام شریک ہے؟'' اس نے کہا،'' ہم تو تمھارا گھر کا نام جانتے ہیں۔''

''شریک کے ساتھ قریب قریب سب سامان دیکھ لیا،'' میں نے کہا۔

''اور کتابیں؟''

''سب پڑھ ڈالیں۔ بعض کئی کئی دفعہ...''

''ان کو آپ سے یہی امید تھی۔''

''استاد کو؟''

''اور آپ کے والد صاحب کو بھی۔''

''میں نے سب کتابیں پڑھ لیں۔''

پھر وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

''وہ ملا؟''

میں سمجھ گیا وہ کس چیز کو پوچھ رہی ہے۔ میں نے ذرا مایوسی کے ساتھ کہا:

''جی ہاں، مل گیا۔ وہ ایک پتھر ہے جس پر پاک نام کھدے ہوئے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''وہ آپ کے خاندان کا نشان ہے۔''

''مگر کیوں؟ میرے باپ نے کہا تھا اس کی خاطر خون بہا ہے۔''

''اس کی کچھ تاثیر ہوگی۔'' طاہرہ بی بی نے کہا۔

''مگر کیا؟''

''کتابیں پھر سے دیکھیے۔''

پھر اس نے استاد کی موت کا حال بیان کرنا شروع کیا۔ اس میں اس کا خطاب زیادہ تر شریک سے تھا۔ استاد کے آخری تین چار دن، اس کی دوا دارو، اس کا مرنا، آخری رسوم، سب کچھ اس نے تفصیل سے بتایا۔ بیچ بیچ میں اس کی آواز ٹوٹ جاتی تھی، غالباً روتی تھی۔ میرے پاس کھڑا ہوا شریک بھی روتا تھا۔ آخر وہ بولا:

''ہم تو ان کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔ آپ نہ ہوتیں تو...''

''تو کیا میت پڑی رہتی؟ ہم نہ اٹھواتے کوئی اور اٹھواتا۔''

اب مجھے کچھ بولنا ضروری معلوم ہوا۔

''مجھے بھی وقت پر اطلاع نہ ہو سکی۔''

''ہم نے تین دفعہ لڑکی کو بھیجا لیکن آپ کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔''

''میں استاد کو ڈھونڈھنے نکل جاتا تھا۔''

''مرنے سے پہلے وہ آپ سے ملنے گئے تھے۔''

''اسی کے بعد... لیکن مجھے ان کا گھر نہیں ملا،'' مجھے استاد کے ساتھ بدسلوکیاں یاد آئیں۔

''میں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔''

''وہ بتاتے تھے اور ہنستے تھے۔''

پھر دیر تک خاموشی رہی۔ آخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے شریک کو چلنے کا اشارہ کیا۔

''اچھا طاہرہ بی بی،'' اس نے ہیولے کو مخاطب کیا،'' ہم لوگ جا رہے ہیں۔''

اس نے ہمیں ذرا دیر رکنے کو کہا۔ ایک چھوٹی لڑکی پردے کے پیچھے سے تانبے کی سینی میں دو گلاس لیے ہوئے نکلی۔ گلاس میں کسی قسم کا شربت تھا۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی،'' میں نے کہا اور گلاس اٹھا لیا۔

''کتابیں پھر سے دیکھیے گا،'' اس نے کہا۔ اور مجھے یاد آیا کہ پاک ناموں والا پتھر میرے گلے میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے اسے اتار کر لڑکی کو دیا، لڑکی نے پردے کے اس طرف جا کر طاہرہ بی بی کو دیا۔ میں نے کہا:

''وہ نشان یہ ہے۔''

پردے کے ادھر سے پتھر کو چومنے کی آواز آئی۔ پھر پاک نام پڑھنے کی آواز آئی۔ لڑکی نے پتھر مجھے واپس کیا۔ میں اسے گلے میں پہن رہا تھا کہ طاہرہ بی بی نے پھر کہا:

''کتابیں دیکھیے گا۔''

(۵)

اس رات سوتے سے میری آنکھ کھل گئی۔ دل دھڑک رہا تھا اور بدن پسینے پسینے تھا۔ میں نے اٹھ کر پانی پینا چاہا لیکن اٹھا نہ گیا۔ یوں ہی پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد طبیعت قابو میں آئی اور میں پھر سو گیا۔ دوسرے دن اٹھ کر پھر کتابوں میں گم ہو گیا۔ ایک بار پھر مجھے حیرت ہوئی کہ میرے بزرگ جو شہر کے سربرآوردہ لوگوں میں تھے، ان کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ میں نے ایک بار پھر اور اس بار بہت غور سے کتابوں کو دیکھنا شروع کیا۔ بہت سے بیان ایسے ملے جن کا اس سے پہلے پڑھنا مجھے یاد نہ آیا۔ خصوصاً ایسے بیان جنھیں لکھنے والوں نے مبہم اشاروں میں لکھا تھا۔ اب میں نے ان بیانوں کو رک رک کر اور دوسرے بیانوں سے ملا ملا کر پڑھنا شروع کیا۔ ان میں خوں ریزیوں کے بیان بہت ملے۔ لوگوں کی موت کے بھی کئی بیان ملے۔ موت کے بیان یوں بھی بہت تھے، لیکن کچھ بیان مبہم اشاروں میں تھے اور

www.taemeernews.com

ان کے ساتھ ،خون ریزیوں کے ساتھ بھی، مجھے محسوس ہوا، پاک ناموں والے پتھر کا بھی ذکر آتا تھا لیکن اس وقت لکھنے والوں کا بیان اور بھی مبہم ہو جاتا تھا۔

آخر میں نے ان سب بیانوں کو صاف صاف نقل کر لیا۔ پرانے کاغذوں اور لکھنے والوں کی شکستہ تحریروں کی وجہ سے وہ بہت زیادہ مبہم معلوم ہوتے تھے۔ میری اپنی مانوس تحریر میں ان کا ابہام کم ہو گیا۔

کئی دن بعد جب میں نے آخری بیان لکھ کر ختم کیا تو خاصی رات گذر چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسی وقت اپنے لکھے کو پڑھنا شروع کر دوں، لیکن مجھے نیند کے جھونکے آ رہے تھے اس لیے میں نے کاغذوں کو باندھ کر رکھ دیا اور سونے لیٹ گیا۔ اس رات پھر مجھے بے چینی محسوس ہوئی، سینے میں درد بھی ہونے لگا۔ میں نے تھوڑا پانی پیا، کچھ دیر تک سینہ سہلاتا رہا۔ درد کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا اور باقی رات میں آرام سے سویا۔

صبح میری آنکھ دستک کی آواز سے کھلی۔ شریک تھا اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے کئی دن غائب رہنے کی معذرت کی۔ مجھے اس کے نہ آنے کا احساس بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کے غائب رہنے کا سبب بھی نہیں پوچھا۔ میرا دماغ کاغذوں میں الجھا ہوا تھا۔ میں شریک کے ہونٹ ہلتے دیکھ رہا تھا لیکن مجھے سنائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر وہ دکان چلا گیا اور میں نے کاغذ نکال کر ان کو پڑھنا شروع کر دیا۔

سب کچھ بہت صاف تھا۔ ہر موت اور ہر خون کے ساتھ یہ ضرور بتایا جاتا کہ پتھر مرنے والے کے پاس نہیں تھا۔ کئی لوگوں نے مرض کی شدت میں اسے گلے سے اتار دیا تھا۔ کئی کے گلے سے اسے اتار کر انھیں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ بعض نے غسل کرتے وقت اسے اتار دیا تھا اور غسل کرنے ہی میں ختم ہو گئے۔ کئی بیماروں کو جب ان کی حالت مایوسی کی ہو گئی، پتھر پہنا دیا گیا تھا اور وہ اچھے ہو گئے تھے۔

پتھر ہمارے خاندان کا نشان تو تھا ہی، مجھے محسوس ہوا کہ خاندان کا سب سے بڑا مسئلہ بھی تھا، اس لیے کہ وہ جب تک کسی کے گلے میں رہتا، اسے موت نہ آتی۔ اس لیے سب اس کے طلب گار رہتے تھے اور اسی لیے اس کی خاطر خون بہتا تھا۔

اب جب مجھے اس کی تاثیر معلوم ہو گئی تھی، میں نے خود کو بہت ہلکا محسوس کیا اور یہ بھی محسوس کیا کہ اب مجھے کوئی کام نہیں رہ گیا ہے۔ دوپہر ہو گئی تھی۔ میں دکان پر چلا گیا۔ شریک موجود تھا لیکن دکان بند کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا:

"کچھ گاہکوں کو بلایا تھا۔ اب پھر وہیں جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"طاہرہ بی بی کے یہاں۔ سویرے آپ کو بتایا تو تھا۔"

اس نے دوبارہ بتایا کہ طاہرہ بی بی کی کوئی پرانی بیماری پلٹ آئی ہے، اور اس بار زیادہ شدت کے ساتھ پلٹی ہے۔

"لیکن اس دن تو وہ بالکل ٹھیک تھیں۔"

"بس اسی کے دوسرے دن سے طبیعت بگڑ گئی۔"

میرا دل اسے دیکھنے کو چاہا، لیکن اب وہ پردے کے پیچھے آ کر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھ کو اس سے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ استاد کے بارے میں وہ مجھ سے بہت زیادہ جانتی ہے، بلکہ میرا خیال تھا وہ میرے باپ کے بارے میں بھی مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ میں بھی وہ باتیں جاننا چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ مر نہ جائے۔ میں نے اپنے گلے سے پتھر اتار کر شریک کی طرف بڑھایا اور کہا:

"اسے میری طرف سے ان کے گلے میں ڈال دینا۔ جب وہ بالکل اچھی ہو جائیں تو..."

لیکن ابھی وہ میرے ہی ہاتھ میں تھا کہ دکان میں ایک لڑکا داخل ہوا اور شریک کو دیکھ کر رونے لگا۔ شریک لپک کر اس کے قریب پہنچا اور لڑکے نے سسکیاں لے لے کر اسے کچھ بتایا۔

"تم چلو، میں آ رہا ہوں۔" شریک نے اس سے کہا اور دکان کے دروازے بند کرنے لگا۔

باہر نکل کر اس نے مجھے بتایا جو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔

"وہ ختم ہو گئیں۔" اور اس کے منہ سے ایک تیز سسکی نکلی۔

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ جا چکا تھا۔

تین دن تک مجھے طاہرہ بی بی کا خیال آتا رہا۔ پردے کے پیچھے اس کا ہیولا مجھے یاد آتا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ کم سے کم مجھ سے وہ چھوٹی تھی۔

کئی دن بعد مجھے پتھر کا خیال آیا۔ میں نے اسے طاہرہ بی بی کو بھجوانے کے لیے گلے سے اتارا تھا۔ اب وہ کہاں تھا؟ میں نے اسے ان جگہوں پر تلاش کیا جہاں اس کے ہونے کی امید تھی۔ مگر وہ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں کئی دن تک اسے تلاش کرتا رہا مگر وہ نہیں ملا۔

ایک رات پھر میرے سینے میں درد اٹھا۔ اور جب میں اپنا سینہ سہلا رہا تھا تو میرے ہاتھ کو پتھر کی سختی محسوس ہوئی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں نے ہر جگہ اسے تلاش کیا تھا لیکن یہ نہیں دیکھا تھا کہ وہ میرے گلے میں پڑا ہوا ہے۔ طاہرہ بی بی کی خبر سنتے وقت وہ میرے ہاتھ میں تھا، اور اس کو دوبارہ اپنے گلے میں ڈالنا مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس وقت وہ میرے گلے میں تھا اور میرے سینے میں درد ہو رہا تھا۔ درد بہت تیز ہوا اور اچانک غائب ہو گیا۔

سویرے اٹھ کر میں نے پاک ناموں والے پتھر کو بہت دیر تک دیکھا۔

اس کو روشنی کے رخ کر کے اور زاویے بدل بدل کر دیکھا۔ اس کے پار کی چیزوں کو اپنی جسامت بدلتے دیکھا اور یہ دیکھا کہ اس پار کی چیزوں پر پاک نام لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

میں نے اسے گلے سے اتار کر ان متبرک چیزوں میں رکھ دیا ہے جو میرے ساتھ دفن کی جائیں گی۔ یہ ضروری تھا، ورنہ شاید پھر اس کی خاطر خون بہنے لگتا ☆☆☆

www.taemeernews.com

کشتی

انور قمر

(سریندر پرکاش کے نام)

لڑکے نے دور سمندر کی سطح پر ایک سیاہ لکیر کو دیکھا تو اسے یہ سمجھ لینے میں دقت نہ ہوئی کہ وہ ایک چھوٹی سی کشتی ہے اور موجوں پر بہتی ہوئی آہستہ آہستہ کنارے کی طرف چلی آرہی ہے۔ وہ ایک مچھیرے کا بیٹا تھا۔ وہ بہت کم عمری میں سمندر سے دوستی کر چکا تھا اور اس کی وسعت اور گہرائی، عظمت اور قوت کا علم رکھتا تھا۔ بہت سی باتیں اسے ورثے میں ملی تھیں، بہت سی گھٹی میں پڑی تھیں۔

وہ ایک ایسی بستی میں رہتا تھا جس کے آسمان پر ابھی کچھ عرصہ پہلے دم دار تارا نمودار ہوا تھا اور کئی دن تک دھیرے دھیرے آگے بڑھتا دکھائی دیتا رہا تھا۔ بستی کے بڑے بوڑھوں کا خیال تھا کہ اب کے سال آسمان سے عذاب اترے گا۔ بڑی تباہی اور غارت گری ہوگی۔ قحط پڑے گا، زلزلے آئیں گے، جنگوں کے امکان بڑھیں گے۔ سمندر سے رزق کم ملے گا۔

دم دار تارے کو بستی کے آسمان پر سے گذرے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ بستی والوں کو سر شام سمندر کی سطح پر، اور وہاں جہاں اس کا دامن آسمان سے مل رہا ہوتا، آگ کی لپٹیں دکھائی دینے لگیں۔

لوگ دیکھتے اور حیران و پریشان ہوتے کہ آگ اور وہ بھی سمندر میں کیسے لگ جاتی ہے؟ چند روز بعد ان کی حیرانی خوف میں بدل گئی جس کے سبب مچھیرے سمندر میں دور تک مچھلیاں پکڑنے کو جانے سے گریز کرنے لگے۔ اور جب وہ مچھلیاں پکڑنے نکلتے تو ان کے عزیز و اقارب اس وقت تک فکر مند اور بے قرار رہتے جب تک سب بعافیت لوٹ نہ آتے۔

بستی والوں کے دلوں میں خوف و دہشت کی کیفیت نے اس وقت اور شدت اختیار کر لی جب انھیں بہت سی انجان اور ڈراؤنی آوازیں رات کے گھپ اندھیروں میں سنائی دینے لگیں۔ ان کے دن کا چین حرام ہو گیا اور رات کی نیند کافور ہو گئی۔ وہ رات گئے تک چوپال میں بیٹھنے اور ان آفات پر تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ مگر کوئی بھی شخص کوئی معقول سبب بیان نہ کر سکا اور ہر کوئی ان مصائب کو دم دار تارے ہی کے اثرات اور نتائج بتانے لگا۔

لڑکا اس کشتی کو اپنی جانب آتا ہوا دیکھ رہا تھا اور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ کچھ سرخ اور بادامی رنگ کے کیکڑے سمندر کی ہر لہر کے ساتھ بہتے ہوئے ساحل پر آجاتے ہیں اور دو چار تو آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے بالکل قریب آچکے ہیں۔ اسے یاد آیا کہ جب اس کا بھائی جھولنے میں پڑا تھا تو جھونپڑے کی چھت سے بندھی ہوئی رسی کے سہارے ایک بچھو نے جھولنے میں اتر کر اسے ڈنک مار دیا جس کے نتیجے میں ننھا ہچکیاں لے لے کر روتا ہوا مر گیا تھا۔

اس کے ماں باپ کے ساتھ سارے بستی والے بھی روتے پیٹتے ہوئے، ننھے بچے کی لاش کو ہاتھوں میں اٹھائے اٹھائے سمندر کے کنارے واقع بستی کے واحد مدفن تک لائے اور مذہبی رسموں کے جاننے والوں نے ادائے رسوم کے بعد اس کے ننھے سے بھائی کو دفنا دیا۔ پھر اور کوئی رسم انجام دی گئی۔ سب نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔ مذہبی ماہرین نے کسی اجنبی زبان میں کچھ دیر تک منتر پڑھے، اس کے ماں باپ کے سر پر ہاتھ رکھ کر انھیں رونے سے منع کیا اور سست قدمی سے بستی کی جانب چل پڑے۔

لڑکا ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جانے کیوں اس کے قدم بہت آہستہ اٹھ رہے تھے یہاں تک کہ آگے جانے والوں اور اس کے درمیان فاصلہ بہت بڑھ گیا اور آخر کار وہ نڈھال سا ہو کر ریت پر ڈھے گیا۔

کچھ دیر بعد وہ روتا ہوا اپنے دوست سمندر سے شکایت کر رہا تھا۔

"کیوں مارا اسے، کیا قصور کیا تھا اس نے؟ بتا۔"

سمندر اپنی موجوں کی زبان سے اسے کیا جواب دیتا؟ اگر وہ کہتا کہ ہماری ہر بات تمھاری سمجھ میں نہیں آسکتی، ہماری صنعت بڑی پیچیدہ ہے، ہمارا کوئی کام بغیر حکمت اور سبب کے نہیں ہوتا، تو کیا وہ مطمئن ہو جاتا؟ اس کی خفگی دور ہو جاتی؟

مگر اسے کہاں ان باتوں کی سمجھ! آخر اس کی عمر ہی کیا تھی، نو برس! وہ تو بچھو کے وجود ہی کو بے معنی اور فضول سمجھ رہا تھا۔

کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد بھائی کی موت کا غم اس کے دل میں مدھم پڑ گیا۔ مگر اس صدمے نے اسے بہت زیادہ سنجیدہ اور سمجھدار بنا دیا تھا۔ وہ

www.taemeernews.com

اپنے باپ اور باپ کے دیگر ساتھیوں کے ساتھ جال بننے میں ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ مچھلیوں کو سکھانے، اور سوکھتی ہوئی مچھلیوں کو پرندوں کے اچک کر لے اڑنے سے بچانے لگا۔ وہ بستی کے بچوں اور بڑے بوڑھوں کا خیال رکھنے لگا۔

انھیں بڑے بوڑھوں سے اس نے طوفان نوح کا قصہ سنا تھا کہ کسی زمانے میں پانی کا ایک ہیبتناک طوفان آیا تھا جس نے پہاڑوں کی بلند چوٹیوں کو بھی غرقابی سے نہ چھوڑا۔ مگر حضرت نوح اور ان کی کشتی پر سوار تمام مخلوق البتہ غرق ہونے سے بچ گئے تھے۔

اس نے حضرت یونس کا قصہ بھی سنا تھا جنھیں ایک مچھلی نے سالم نگل لیا تھا۔ وہ کئی دن تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہے۔ پھر اللہ کی مرضی کچھ ایسی ہوئی کہ مچھلی کے پیٹ سے صحیح سلامت نکل آئے۔

وہ سوچتا، پیغمبر کتنے دن مچھلی کے پیٹ میں رہے ہوں گے؟ پیٹ میں کس قدر گہرا اندھیرا ہوگا۔ وہ اندھیرے غار جیسے پیٹ میں کیا کرتے ہوں گے؟

بڑے بوڑھے کہتے، بیٹا یہ اوپر والے کا کرم تھا جو انھیں مچھلی کے پیٹ میں بھی زندہ رکھا اور صحیح سلامت باہر نکال دیا۔ وہ جب چاہتا ہے اندھیرے میں روشنی اور زرا سا کے گھور اندھیرے میں آسا کا دیپ جلا دیتا ہے۔

لڑکے کو ایسے قصے سن کر روحانی قوت ملتی اور وہ مثبت سوچ اور بلند حوصلے کے ساتھ اپنے روزمرہ کے کام کرتا۔

بستی میں ایک بڑھیا بھی رہتی تھی۔ بڑے بوڑھے کہتے کہ اس کی عمر بہت ہے اور وہ اسے اسی بوڑھی حالت میں اپنے بچپن سے دیکھتے آئے ہیں۔ کوئی اسے سو برس کی بتاتا، کوئی ڈیڑھ سو کی خبر لاتا۔ اس کی کمر جھک چکی تھی، چہرے پر مکڑی کے جال جیسی جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کا منھ پوپلا ہو چکا تھا، زبان میں لکنت تھی، ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ مگر اس کے تین توئی اور اعضا قابل رشک حد تک توانا اور فعال تھے۔ یعنی وہ لاٹھی ٹیک کر اچھی خاصی رفتار سے چل لیتی تھی، اس کی آنکھوں میں نور باقی تھا، اور وہ دور ہی سے کسی کی آواز یا آہٹ کو سن کر پہچان لیتی تھی۔ اگر وہ دیکھ لیتی تو اپنے مخصوص انداز میں خوب پھنکارتی، دھتکارتی، کوستی کاٹتی پھر پاس بٹھا کر بلائیں لیتی۔ اس کے گھر کے ایک ایک شخص کا احوال پوچھتی اور پھر اپنے مطلب پر آ جاتی کہ میرے بیٹے شکار سے لوٹے یا نہیں؟ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کے چار بیٹے مچھلیاں پکڑنے گئے تھے، کوئی پچاس ساٹھ برس پہلے، مگر لوٹ کر نہیں آئے۔

ان کے لوٹ آنے کے متعلق بڑھیا کے پوچھنے کا انداز یکساں اور بندھا ٹکا تھا:

''بتا، کیا وہ آئے؟''

''نہیں ماں نہیں''، مخاطب جواب دیتا۔

''کوئی نہیں آیا؟''

''کوئی نہیں۔''

''چاروں میں سے ایک بھی نہیں؟'' بڑھیا کی آواز میں مایوسی شامل ہو جاتی۔

''نہیں، ایک بھی نہیں۔'' مخاطب افسردگی سے جواب دیتا۔

جواب سے مطمئن نہ ہو کر وہ مخاطب کو ڈانٹتی اور کہتی:

''میری آنکھوں میں دیکھ اور پھر جواب دے۔''

وہ اپنے ملاقاتی کے بازو اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے تھام لیتی۔ پیلی بجھتی ہوئی قندیلوں سی آنکھیں آواز میں دبدبہ، چہرہ پر جلال، لیکن سب بے سود۔

نہیں ماں، کوئی نہیں آیا۔''

''کوئی نہیں؟''

اس کی آواز ڈھیلی پڑ جاتی، ہاتھ ملاقاتی کے بازوؤں سے سرک کر ریت پر ٹھہر جاتے۔ کچھ دیر رک کر وہ کہتی:

''دیکھ، وہ ضرور آئیں گے۔ اور یاد رکھ اور میری بات بستی میں سبھوں سے کہہ دے کہ جب تک وہ نہیں آتے میں یہاں سے جانے کی نہیں۔ سمجھا؟ اب جا، بھاگ جا۔''

یہ کہہ کر وہ بوسیدہ چٹائی پر پڑ جاتی، گودڑی اوڑھ لیتی، بعد ازاں جانے کیا سوچتی، کیسے خواب دیکھتی۔

بستی جس جزیرے پر واقع تھی اس کے ایک حصے میں درختوں کے جھنڈ تھے اور ان درختوں پر رنگ برنگے پرندے بسیرا کرتے تھے۔

لڑکا ان لکیروں کے گرد انگلیوں سے دائرے کھینچ کھینچ کر اپنے تصور میں ان کی حد بندی کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک ننھی سی ڈالی جس پر بمشکل تمام چار چھ سبز پتے لگے تھے، فضا میں لہراتی ہوئی آئی اور اس کے سامنے بچھ گئی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ ایک سہ رنگی پرندہ اس کے سر پر سے گذر رہا تھا۔ لڑکے نے ڈالی کو اچھے شگون کی علامت سمجھ کر اٹھا لیا اور اسے اپنے کان میں اڑس لیا۔

سورج ایک ٹیکری کی آڑ سے بلند ہو چکا تھا۔ لڑکے نے ہاتھ کی اوٹ سے کشتی کو دیکھا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کچھ دیر بعد وہ کنارے پر آ لگے گی تو وہ تیزی سے بستی کی جانب دوڑ پڑا۔

شام ہوتے ہوتے کنارے پر بستی کے تمام لوگ آ کر جمع ہو چکے تھے۔ ان میں جو بڑے بوڑھے تھے، کٹھن معاملات میں ان ہی کو بولنے کا حق تھا۔ وہ جو کہتے سب اسے دھیان سے سنتے۔ چنانچہ انھوں نے کشتی میں پڑے ہوئے ان نیم مردہ سے بوڑھوں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ ان کی شکل و شباہت ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی۔ انھوں نے ایک ہی قسم کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ اس بستی کے معلوم ہی نہیں ہوتے تھے۔ وہ تو اس عہد کے بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ مگر وہ بڑھیا چیخ چیخ کر کہے جا رہی تھی:

www.taemeernews.com

''آگئے میرے لال، آگئے! انھیں گھر لے چلو! ان کے منہ میں دودھ ٹپکاؤ۔ انھیں شہد چٹاؤ، میرے لال بھوکے ہوں گے۔ جانے کتنے دنوں انھوں نے اناج کی صورت نہ دیکھی ہوگی۔ چلو جلدی کرو''۔

وہ سب کو اپنی لاٹھی سے ہٹاتی کشتی کے پاس پہنچ چکی تھی اور مسلسل ان کی بلائیں لیے جا رہی تھی۔

''مائی! یہ تیرے بیٹے نہیں ہیں۔ تیرے بیٹے اتنے بوڑھے کیسے ہوگئے؟''

''کیا کہتے ہو تم؟ یہ بوڑھے ہیں؟''

''ہاں مائی، تیری اور ان کی عمروں میں ہمیں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔''

''سنو، سنو، یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ میرے بیٹے نہیں ہیں؟ ارے کم بختو کیا تمھیں نہیں معلوم کہ میری ماں کے بھی چار بیٹے تھے اور میں اکلوتی بیٹی۔ وہ بھی میرے بیٹوں کی طرح مچھلی کے شکار کو گئے تھے۔ اکٹھے، مگر سمندر نے انھیں واپس کا راستہ نہ دیا، وہ بھٹک گئے، جانے کہاں چلے گئے؟ آج آئے ہیں، انھیں نکالو، کچھ کھلاؤ، پلاؤ، میرے گھر لے چلو، یہ میرے بھائی ہیں۔''

''مائی تم تو اپنے بیٹوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ اب بھائیوں کا ذکر لے بیٹھیں اور ان پر اختیار جتا رہی ہو؟''

''احمقو! ماں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتی ہے، وہ اپنے بھائیوں کی پرکھ بھی رکھتی ہے۔۔ اب چلو جلدی۔ میرا منھ کیا تک رہے ہو۔''

انھوں نے چاروں بوڑھوں کو اپنے کاندھوں پر بٹھایا اور بڑھیا کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ بڑھیا لاٹھی ٹیکتی کپکپاتی ٹانگوں سے بستی کی طرف چلی جا رہی تھی اور اس تمام ہجوم کے پیچھے بچہ ساحل پر بیٹھا انھیں جاتا دیکھتا رہا۔

اس کے دل میں بڑھیا کے بیٹوں کے لوٹ آنے کی امید اب پہلے سے زیادہ مستحکم ہو چکی تھی۔

جب رات ہونے لگی اور سمت بتانے والا تارا نکل آیا تو وہ بھی اپنے گھر کو چلا۔ ریت پر اس کے پیروں کے نشان پڑتے گئے اور اس کے دل کے تمام گوشوں سے اپنے ننھے بھائی کی موت کا غم محو ہوتا رہا ☆☆☆

شمس الرحمن فاروقی

غالب پر چار تحریریں

قیمت : ۱۰۰ روپے

سہ ماہی **روشنائی** کراچی

منفرد اور عہد ساز نقاد، شاعر، افسانہ نگار، محقق، مترجم، دانشور

شمس الرحمٰن فاروقی

کے ادبی قدوقامت کا مکمل جائزہ، نئی تحریروں، تصویروں، اور محاکموں پر مبنی مضامین کے ساتھ

شمس الرحمٰن فاروقی نمبر

بہت جلد پیش کرنے والا ھے

احمد زین الدین، مدیر ''روشنائی''

Zain Publications, A-B,
Nadeem Corner, "N" Block,
North Nazimabad,
Karachi 74700

سہ ماہی

کاروان ادب

ملک کے نامور ادیب، ناقد، لغت نگار، شاعر، افسانہ نگار ادبی صحافی، جدیدیت کے بنیاد گذار

شمس الرحمٰن فاروقی

کے بارے میں پانچ سو صفحات کی ایک خاص اشاعت
نایاب تصاویر، معاصروں کے خراج عقیدت، تنقیدی جائزوں اور انفرادی محاکموں سے مالامال
بہت جلد شائع کر رہا ہے۔

کوثر صدیقی، مدیر، کاروان ادب

Zeb Villa, 78-A, Ginnauri
Main Road, Bopal

www.taemeernews.com

حبیب حق

[شاہد اختر کے لئے : منزل ہے کہاں]

سقراط : کیا تم فکر کرنا اسی کو کہتے ہو جسے میں کہتا ہوں فکر کرنا؟

تھائی ٹی ئیس (Thyteus): وہ ہے کیا؟

سقراط : کچھ بھی دیکھ کر جو گفتگو روح خود سے کرتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے جب سوچنے کے عمل میں وہ مشغول ہو جاتی ہے تو گفتگو کرنے کے سوا، اور سوالات کے پوچھنے اور ان کے جواب دینے کے سوا، اور اگر چاہے تو کسی امر کو ماننے یا نہ ماننے کے سوا کچھ اور نہیں کرتی۔ اور جب وہ کسی ایک نتیجے پر پہنچ جاتی ہے اور کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہ جاتا، تو اس صورت حال کو ہم رائے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور جسے میں رائے کا قائم کرنا کہتا ہوں وہ تو یہی گفتگو ہے۔ اور اس لئے وہ کلام ہے جو ہم کسی کے ساتھ (مل کر) انجام دیتے ہیں، یا پھر بصد اطمینان وخوشی ہم خود اپنے ساتھ کرتے ہیں۔

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں

(۱) بھٹکا ہوا راہی میں

''مجھے معاف کریں میں [غلام نبی] آپ [شریف حسن] کی مدد نہیں کر سکتا۔''

''کیوں جناب، ایسی کیا بات ہے؟''

''آپ مجھے معاف فرمائیں، لیکن آپ اسلام کی روح سے واقف نہیں ہیں۔''

''تو میری استدعا ہے کہ آپ مجھے اسلام کی روح سے واقف ہونے میں مدد کریں۔''

''جیسا کہ میں نے عرض کیا، میں مدد نہیں کر سکتا۔''

''آخر کیوں؟''

(شریف حسن ٹھنڈے تھے، لیکن گرمی رفتہ رفتہ واڈکا (Vodka) کے مانند چڑھ رہی تھی۔)

''اس لئے بھائی صاحب، کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں بہت ہی جلدی میں ہوں۔''

''لیکن مجھے آپ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

''اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں۔ آپ کیا زبان عربی سے واقف ہیں؟''

''بچپن میں پڑھی تھی۔ اب تو سب بھول گیا ہوں۔''

''کہاں پڑھی تھی؟''

''گھر پر۔ ہمارا آبائی مکان سندیلے کے نزدیک ایک گاؤں میں تھا۔''

''سندیلہ... جہاں کے لڈو مشہور ہیں؟''

''جی ہاں، وہی سندیلہ۔''

''اچھا تو آپ وہاں کے رہنے والے ہیں، صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کے؟''

''جی ہاں۔ منصوری ہمارے قصبے کا نام تھا، ہم چھوٹے موٹے تعلقہ دار تھے۔''

''تو اب بھی آپ کے عزیز واقارب وہاں رہتے ہوں گے، کیوں؟''

''جی نہیں۔ تقسیم ہند کے بعد شیرازہ بکھر گیا۔ ساری املاک اونے پونے فروخت ہوگئی۔ زیادہ تر عزیز کراچی جا کر پھٹے حالوں رہنے لگے۔ کچھ سندیلہ اور لکھنؤ جا بسے۔ ہماری ایک وراثت تھی، ایک تہذیب تھی، سب کی سب ہم مسلمانوں کی کوتاہ اندیشی کی بدولت غارت ہوگئی۔ اغیار نے فائدہ اٹھایا۔''

''آپ کے اور بھی بھائی اور بہن تو ہوں گے؟''

''جی ہاں۔ ہم چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ ایک راولپنڈی میں ہے، دوسری سرگودھا رہتی ہے۔''

www.taemeernews.com

''اور باقی سب؟''

''بہنوں کی شادیاں اقارب میں ہوئیں۔ بڑے بھائی کراچی جا بسے۔ ان کے بچے ہونہار نکلے۔ مجھ سے دو چھوٹے بھائی کراچی ہوتے ہوئے انگلستان جا بسے۔''

''انگلستان میں کہاں؟''

''ایک برمنگھم میں ہے۔ دوسرا شیفیلڈ میں۔''

''کیا کیا کرتے ہیں آپ کے بھائی صاحبان؟''

''برمنگھم والا تو وہاں کی یونیورسٹی میں ساؤتھ ایشیا کی تاریخ پڑھاتا ہے۔ دوسرا انجینیر ہے۔''

''اور آپ یہاں نیویارک میں جمے ہوئے ہیں۔ ماشااللہ!''

''جی ہاں۔ میں ۱۹۵۹ میں نیویارک آگیا۔ تب سے اس بھرپور شہر سے چپکا پڑا ہوں۔''

''اور آپ خود کیا کرتے ہیں، برادر گرامی؟''

''ایک پبلشنگ ہاؤس ہے، اسی میں ملازم ہوں۔''

''وہاں کام کیا کرتے ہیں صاحب؟''

''جو بھی کتاب ہماری کمپنی شائع کرنے والی ہوتی ہے، میں اس کی گرامر درست کیا کرتا ہوں۔''

''واہ، سبحان اللہ... میں یہ سارے سوالات اس لئے کر رہا ہوں کہ آپ جو اتنے دنوں سے اس ملک میں رہ رہے ہیں... معاف فرمائیں اپنے مذہب سے اس قدر ناواقفیت رکھتے ہیں۔''

(شریف حسن کا مزاج ذرا گرم ہوا۔ انھوں نے پلکیں جھپکائیں۔ دائیں ہتھیلی سر پر پھیری، ٹھنڈے ہوئے۔)

''جی مجھے اس امر پر سخت افسوس، ندامت، اور شرمساری ہے۔''

[غلام نبی نے جانا میں نے بہت بڑا تیر مارا، کہ ساری بحث غنیم کو بے جان کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ ان مباحث میں دل جوئی اور محبت و آشتی کا کوئی گذر نہیں۔]

''آپ کے کتنے بچے ہیں؟''

''میں نے جناب شادی نہیں کی۔''

''ایسا کیوں؟ یہ قطعی غیر اسلامی حرکت ہے۔ مجرد رہنا غیر شرعی ہے۔''

[شریف حسن کو اپنے چچا کا قول یاد آیا، وہ لہک لہک کر پڑھا کرتے تھے:

مجرد سب سے اعلیٰ ہے
نہ جورو ہے نہ سالا ہے
اکیلے میں دیوالی ہے
دکیلے میں دوالا ہے

وہ ہلکے سے مسکرائے۔ صحیح معنی میں میں مجرد کبھی نہیں رہا۔] آپ یہ جان لیں کہ ہر مسلمان کو شادی ضرور کرنی چاہئے۔ اولادیں پیدا کرنا چاہئے۔''

''غالباً آپ درست فرما رہے ہیں، لیکن جناب اگر کوئی تمنائے مقاربت سے بے نیاز ہے تو کیا کرے؟''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے کوئی بیماری لاحق ہے تو علاج کرائے۔ مرد کا اولین کام نسل کی ترویج ہے۔''

''سائنس بھی یہی کہتی ہے۔ ایک بار میرا ارادہ ہوا بھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں بات ٹل گئی۔''

''کیوں ٹل گئی؟ کیا لڑکی والوں نے انکار کر دیا، یا آپ کے والدین راضی نہیں ہوئے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا، وہ نہ باحیا نکلی اور نہ مہذب۔ آپ بتائیں مولانا میں ایسی لڑکی سے کیوں کر شادی کر لیتا۔ اپنے خاندان کی ناموس کو مٹی میں ملا دیتا؟''

''آپ کے والدین کا کیا خیال تھا؟''

''میرے والدین کو اس معاملے کی کچھ خبر نہ تھی۔''

''کیا کہا آپ نے برادر من؟ یعنی یہ کہ آپ اپنے والدین کی اجازت کے بغیر شادی کرنے والے تھے؟''

''جی آپ یہی سمجھ لیں۔''

''لڑکی کیا عیسائی تھی، یعنی امریکی؟''

''جی نہیں۔''

''پھر کیا تھی؟''

''جی وہ... لڑکی ہندو تھی۔''

''تو ایسا ہوا ہوگا کہ آپ نے اسے مسلمان ہونے کو کہا ہوگا، اور اس نے قطعی طور پر انکار کر دیا ہوگا۔''

''نہیں ایسی بات نہیں تھی۔''

[شریف حسن بیزار سے ہو چلے تھے، غلام نبی کی باچھیں کھلی سی جا رہی تھیں۔]

''تو کیا آپ مسلمان کئے بغیر اس سے عقد کرنا چاہتے تھے؟''

''آپ یہی سمجھ لیں۔''

''لیکن شریف حسن صاحب یہ تو قطعی غیر اسلامی حرکت ہے... تو پھر عقد کیوں نہیں ہوا؟''

''آپ مولانائے محترم ہیں یہ بات سمجھ نہ پائیں گے۔''

[شریف حسن نجیب الطرفین تھے۔ ایک مخصوص ہند اسلامی گنگا جمنی تہذیب گومتی ندی کے بہاؤ کے ساتھ ان کے اندر باقی تھی۔]

''آپ بتائیں تو عزیز محترم!''

''مختصراً آپ یوں جان لیں کہ میں اس سے عشق کرتا تھا اور وہ عشق کرنے کے قابل نہ نکلی۔ آپ جناب سمجھ نہ پائیں گے کہ ایک مسلمان مرد، شرعی اعتبار سے ایک غیر منکوحہ سے کیوں کر عشق کر سکتا ہے۔''

[غلام نبی کی ناک ذرا پھولی: بڑا بقراط بنتا ہے پاپی کہیں کا۔]

www.taemeernews.com

''آپ نے کہا ہے کہ وہ بے حیا تھی...کیا وہ اوباش تھی؟''

''آپ یہی مان لیں۔''

''کیا دوسروں سے اس کے تعلقات تھے اور عین موقع پر آپ نے جان لیا؟''

''مولوی صاحب، معاملہ دوسروں سے جنسی تعلقات کا نہ تھا۔ معاملہ حیا کا تھا، تہذیب وشرافت کا۔''

''یعنی؟'' [ایسا ہے کہ ان نیم انگریزوں کو راہ راست پر لانا سخت دشوار ہے، غلام نبی نے سوچا۔]

''یعنی کہ ایک حیادار فرد نہ صرف دوسروں کو فریب نہیں دیتا، بلکہ خود کو بھی فریب نہیں دیتا۔''

''بھتیا...آ آ آپ...میں تو جانتا ہوں کہ حیادار شخص اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرتا ہے۔''

''یہ ایک حتمی مسئلہ ہے۔''

''یعنی یہ کہ کوئی کتنا ہی آوارہ، بدمعاش، شرابی، زانی کیوں نہ ہو، وہ باحیا ہوسکتا ہے۔''

''طوائفوں کے محلے میں رہنے والا ایک دلال جس میں یہ ساری خرابیاں بدرجہ اتم موجود ہوں، باحیا ہوسکتا ہے...لیکن مولوی صاحب آپ معاملے کو سمجھنے کی کوشش شاید نہیں کر رہے ہیں...معاملہ عشق کی ہمہ گیری اور تہذیب کی پاس داری کا ہے۔''

''میں جناب ایک مسلمان ہوں، اور ہر ایک مسئلے کو اسلام کے سچے اور واضح اصولوں کی روشنی میں دیکھتا ہوں۔''

''مولانا (یہاں شریف حسن لفظ ''مولانا'' علی گڑھ کے ذرا تحقیری انداز میں کہہ رہے تھے،) بات یہ ہے کہ حیادار شخص بنیادی طور پر اپنی تہذیب سے وابستہ رہا کرتا ہے، اور ہر تہذیب کی اپنی نفاست اپنا شعور، اپنا ذوق ہوتا ہے۔''

''یعنی؟''

[غلام نبی ذرا دبے نظر آرہے تھے لیکن رن کیوں کر چھوڑ سکتے تھے، جنگ قادسیہ میں فتح پانا ان کے شعور میں داخل تھا۔ سیاہ پر سفید کو غلبہ پانا مشیت ایزدی تھا۔]

''یعنی اگر وہ مہذب ہے تو ساری دنیا بلکہ ساری کائنات کو تہذیب کے دائرے میں شامل کر اس پر نظر ڈالتا ہے، انھیں جانتا اور سمجھتا ہے۔ مہذب انسان، انسان دوست اور انسان پرست ہوتا ہے۔ من وتو کا فرق اس کے ہاں بہت ہی کم رہ جاتا ہے۔ اگر تمام انسان معاشرے میں یکساں حقوق رکھتے ہیں، تو پھر انسانوں کے درمیان فرق کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی ہے۔ باحیا انسان اطلس (Atlas) دیوتا کی مانند ساری دنیا کو اپنے کاندھے پر اٹھائے رکھنا چاہتا ہے۔''

''آپ یہ بات ذرا غلط کہہ رہے ہیں۔ یاد رکھیں ایک مسلمان ایک غیر مسلم سے قطعی مختلف ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ تقویٰ میں برتر ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اسلامی اقدار کا حامل ہے اور شریعت محمدی پر گامزن رہتا ہے۔''

''آپ بھول رہے ہیں کہ تقویٰ کی بنیاد حیا ہے، اور جملہ اسلامی اقدار حیا پر قائم ہیں... بہرحال، آپ کے خیال سے اسلامی اقدار کیا ہیں؟ کیا وہ تہذیب کا حصہ نہیں؟''

''میرے خیال سے ہرگز نہیں۔ اسلام کے اعتبار سے خدائے واحد و کامل پر مکمل یقین رکھنا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا پیغمبر اور خاتم النبیین جاننا، نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا، زکوۃ دینا، سارے مسلمانوں کو ایک ملت کا فرد جاننا، اور اگر ضرورت پڑے تو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مستعد رہنا، ان بنیادی عقائد کی بدولت جو اقدار ظہور میں آتے ہیں، وہی اسلامی اقدار ہیں۔''

''لیکن پیغمبر اسلام نے یہ بھی تو کہا ہے کہ انسانوں کے درمیان رنگ و نسل کی کوئی قید نہیں بلکہ سارے انسان خدا کے حضور میں یکساں ہیں۔ فرق اگر ہے تو تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ اور تقویٰ سراسر حیا کا خوشہ چیں ہے۔ کوئی بھی شخص نہ تو بہتر انسان ہوسکتا ہے، اور نہ تو رحمت الٰہی کا مستحق ہوسکتا ہے اگر وہ حیادار اور مہذب نہیں ہے۔ مزید یہ کہ تقویٰ براہ راست معاشرے پر اثر انداز نہیں ہوتا، بلکہ بالواسطہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سارے انسان برابر ہیں۔ سب کے یکساں حقوق ہیں۔ لیکن کھیتوں میں کام کرنے والا مزدور مراعات کے سلسلے میں آپ کی برابری نہیں کرسکتا۔''

''ایک بات آپ بھول رہے ہیں شریف حسن صاحب، حضورؐ نے یہ بھی کہا تھا کہ اب دین مکمل ہوگیا۔ یعنی اسلام کے حصار کے اندر سارے انسان مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ ملت کے باہر جو بھی ہیں وہ ہم میں سے نہیں۔ ہم ان کی عزت وقدر کرسکتے ہیں، ان کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرسکتے ہیں، لیکن ہم میں اور ان میں اس وقت تک بنیادی فرق رہے گا جب تک کہ وہ اسلامی حصار کے اندر نہ آجائیں، اور ہم جیسے مسلمان نہ ہوجائیں۔''

''یوں مولانا صاحب آپ انسانی عالمگیریت، اخوت اور مساوات پر گہری ضرب لگا رہے ہیں۔ میرے بھائی میں اسلامی نقطۂ نظر سے مسائل کی وضاحت کر رہا ہوں۔ اسلام یہ کبھی نہیں سکھاتا کہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھو، ان کی بے عزتی کرو۔ وہ صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ضرور ہیں، انھیں صحیح راہ پر آنے کی تلقین کرو۔ اور اگر وہ تم سے جنگ کے خواہاں ہوں تو دفاع کی خاطر ان سے جہاد کرو نہ کہ انھیں پیس ڈالنے کی خاطر۔''

''کیا یہ ضروری نہیں کہ جو اسلام کے بنیادی عقائد کو نہ مانتا ہو، ان کی تذلیل کرتا ہو، اسے بزور اسلامی راہ پر لایا جائے؟ محض تلقین کبھی بھی ہمیں اسلام کو سرفراز کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔''

''اگر ملت اسلامیہ ایسا قدم اٹھائے گی تو پوری دنیا میں جنگ وجدل کا ماحول پیدا ہوجائے گا۔ پھر نہ تو اسلامی تہذیب فروغ پاسکے گی اور نہ اسلامی اقدار عالم گیر مقبولیت کا درجہ حاصل کرسکیں گے... مولوی صاحب آپ نے فاشیت کا نام تو ضرور سنا ہوگا اور فاشیوں کے عقائد سے بھی واقف ہوں گے، کیوں؟''

''جی ہاں، بے شک۔''

www.taemeernews.com

''تو جو کچھ آپ فرما رہے ہیں اس سے فاشیت کی بو نہیں آتی کیا؟''
''معاف کیجئے، آپ انتہائی گمراہ کن اور غیر اسلامی بات کر رہے ہیں۔''

''مولانا، مجھے افسوس ہے کہ مجھے ایسی بات کہنی پڑ رہی ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ ہمارے رسول حضرت محمدؐ ایک نئی اور عالم گیر تہذیب کی بنیاد ڈال رہے تھے۔ اس تہذیب میں انسانوں کے درمیان کسی قسم کا فرق باقی نہ رہ جاتا۔ میں اس ادھیڑ بن میں ہوں کہ اس زمانے میں کس طرح اس تہذیب کو ایسے وسائل نصیب ہو سکتے ہیں کہ وہ عالمگیر...''

''بھائی شریف حسن صاحب، آپ لائق اور ذہین آدمی ہیں۔ آپ عالمی انسانی برادری اور اخوت کے خواہاں ہیں۔ لیکن آپ عرصہ دراز سے نیویارک میں رہ رہے ہیں، اور امریکہ کے بنیادی اقدار کو آپ نے اپنے اندر سمو لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسلامی عقائد کی کارفرمائی آپ کی روح میں بہت مدھم پڑ گئی ہے۔

''دیگر یہ کہ آپ نے اپنی جستجو کے دوران عربی کتابوں سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ بلکہ اب تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ اردو میں لکھی ہوئی اسلامی کتابوں سے بھی آپ مستفید نہیں ہوئے۔ اشد ضرورت ہے کہ آپ اس خامی کو دور کرنے کی سعی فرمائیں۔ کیوں کہ آپ (معاف کیجئے) بالکل چوں چوں کا مربہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو راہ راست پر لائے۔''

(۲) سنگ نے رتبہء آئینہ کیا ہے پیدا

'چوں چوں کے مربہ' شریف حسن ۱۹۳۴ میں سندیلہ کے پاس منصورہ گاؤں میں درجہ دوئم کے ایک تعلقہ دار خاندان میں تولد ہوئے تھے۔ پورا نام سید محمد شریف الحسن ماژندرانی تھا جو گھٹ گھٹا کر شریف الحسن رہ گیا تھا۔ سب امریکی، کیا مرد کیا عورت، پیار سے انھیں ''شیری'' پکارتے تھے۔ وہ ہر شیریں لب کا بوسہ لینے کے لئے بے تاب رہے کرتے تھے۔ بار بار سید انشا کا مصرع گنگناتے: اب تو ٹھہری ہے بوسے لیں گے دس! بوالہوسی غالباً مازندران سے آئی تھی جسے اودھ کی تپش نے تیتیا مرچ بنا دیا تھا۔

منصورہ کی سرکار شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ کے دور میں میر منصور علاء الدین نجدی ماژندرانی کو مدد معاش میں ملی تھی۔ بعد میں اودھ کے نوابان بھی مہربان رہے۔ آہستہ آہستہ ماژندرانی گھرانہ تعلقہ داروں کی جماعت میں داخل ہو گیا اور جلد ہی اپنی کوششوں کی بدولت بڑے زمینداروں میں شمار ہونے لگا۔ ۱۸۵۷ کی شورش میں منصورہ کے تعلقہ داروں نے انگریز کا ساتھ دینا مناسب نہ سمجھا۔ ماژندرانی سربراہ خاندان نے باغیوں کا ساتھ دیا، اور شکست یاب ہندوستانی فوجیوں کو پناہ بھی دی۔ بعد غدر کے فرد ہونے کے سرکار انگلشیہ نے ان کی ڈیوڑھی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ پھر جاگیر میں کمی کر دی۔ لیکن ماژندرانی سیدوں کی پیشانی پر بل نہ آیا۔

یہ زمیندار اور ان کے جیالے سپوت جب بھی لکھنؤ جاتے تو طوائفیں ''نواب صاحب'' کہہ کر خاطریں کرتیں۔ وہ محفلوں میں شامل ہوتے تو ڈیرہ دارنیاں شب باشی کے لئے ہمہ وقت تیار رہا کرتی تھیں۔ لیکن ماژندرانیوں نے کبھی بھی نہ تو کسی ماہ رو سے عقد کیا اور نہ کسی کو لکھنؤ میں مکان دلا کر رکھا۔ سب نے خاندان میں شادیاں کیں، جو کہ خاصا وسیع ہو گیا تھا۔ ان کے سب مرد و زن کا رنگ سرخ و سفید ہوتا، آنکھیں یا تو بھوری یا سیاہ۔ ماتھا فراخ، ناک ذرا اوپر کو اٹھی ہوئی یا توتی لب بھرے بھرے۔ اہل ثروت اور اعلیٰ خاندان والے ان کی لڑکیوں سے عقد کے متمنی رہتے تھے۔

شریف حسن سولہ سال کے ہو رہے تھے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیج دیئے گئے۔ ذہن بالغ ہو رہا تھا، وہاں کی تہذیب اثر انداز ہوئی۔ انٹر سائنس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ایک امریکی پروفیسر ہندوستان کا دورہ کرتا ہوا مسلم یونیورسٹی آیا۔ شریف حسن کی ذکاوت اسے بھا گئی۔ اس نے انھیں اپنی واشنگٹن اسٹیٹ یونیورسٹی میں بی۔ اے میں داخلہ دلا دیا۔ انیس برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ شریف میاں امریکہ پلمین جا کر برف وطوفان اور سنہری بالوں والی لڑکیوں کے نرغے میں پھنس گئے۔ ذہین تھے اور جستجوئے علم کا سورج نصف النہار پر تھا۔ نہ صرف بی۔ اے سا کم لاوڈے (Summa cum Laude) کیا، بلکہ اسی دوران چار نو بہاران چمن سے مستفید ہو کر اپنے ماژندرانی خون کی گرمی کو بھی آزمایا۔

شریف حسن یونیورسٹی سے نکلے تو ۱۹۵۷ کے آخری دنوں میں شکاگو کے ایک اخبار میں انھیں نوکری مل گئی۔ ابھی وہ اپنے جوش مردانگی اور ولولہ الفت کو پوری طرح آزما نہ پائے تھے کہ نیویارک کی ایک مشہور پبلشنگ کمپنی رینڈم ہاؤس (Random House) میں ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ نیویارک کی کشش انھیں کھینچ لائی، نیویارک جہاں ہر طرز کی آزاد روحسینائیں گلیوں گلیوں ماری پھرا کرتی تھیں۔ انھوں نے مستقل طور پر نیویارک کے مین ہیٹن (Manhattan) علاقے میں ایک اچھے اپارٹمنٹ کو اپنا گھر بنالیا۔ تنخواہ اچھی تھی۔ اس مدت میں شیریں سرخ شراب (Sweet red wine) بھی دل کو بھا گئی تھی، تیز شرابیں زیادہ پسند نہ آئیں۔ جلد ہی وہ اس عالم سرخوشی کے دیوانے ہو گئے جہاں سوچ کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

شریف حسن پر تین جہیں اک دوسروں کے بعد چڑھتی چلی گئیں۔ پہلی جو کہ منصورہ نے ان کے نازک شہابی رنگ والے جسم پر چڑھائی تھی۔ دوسری مسلم یونیورسٹی نے، جب ان کے شعور میں بلوغت آ چلی تھی۔ وہ جذب کرنے کی اتھاہ قوت رکھتے تھے۔ منصورہ نے انھیں گرم و سرد، اشتہا بھانے کی خواہش، رنگوں، مناظر اور چیزوں کو جاننا سکھایا۔ یہاں انھوں نے حروف کو پہچانا، الفاظ کو صورتوں میں دیکھا، کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ خدمت گار عورتوں کے کولھے عجیب سے لگے اور ان کی چھاتیاں دل کو لگیں۔ تیسری تہ ان پر امریکہ میں چڑھی، جہاں انھوں نے صحیح اور غلط میں امتیاز کرنا اپنی سرشت کے اعتبار سے جانا، کتابوں سے عشق کرنا سیکھا، اور ماہ رخوں کے ساتھ بستر میں لیٹ کر منزل سعادت کی جانب پہنچنے کی سعی کی۔

www.taemeernews.com

شریف حسن ذرا شولیدہ خاطر ضرور ہوئے، یہ کیفیت ان پر ہمیشہ کے لئے طاری ہوگئی۔ ماژندرانی خون، ہندوستانی نشو و نما، امریکی رنگ برنگے لباس نے گنگا جمنی تہذیب کے ایک نونہال کو اس دمدار ستارے کی مانند بنادیا جو خلائے بسیط میں آوارگی کرتا پھرتا ہے، اور جہاں تہاں منہ مارتا چلتا ہے۔

(۳) اللہ دلائے، مولا دلائے

مولانا غلام نبی صاحب سے شریف حسن کی جو گفتگو اوپر بیان ہوئی، وہ اکتوبر ۱۹۸۱ میں ہوئی تھی، نیویارک کے علاقے کوینس (Queens) میں واقع عالی شان مسجد میں جہاں غلام نبی نائب امام تھے۔ مسجد کے امام ایک ضعیف مصری عالم تھے جن کی بصارت کم ہوتی چلی جارہی تھی۔ وہ رنڈوے تھے، اور کبھی شیخ حسن البناء شہید سے متاثر رہے تھے۔ پھر جب حالات حاضرہ پر غور کیا تو اپنے لئے اعتدال کی راہ نکال لی۔ ضعیفی تھی، ذکر الٰہی میں مشغول رہا کرتے۔

غلام نبی صاحب کشمیری النسل تھے۔ ان کا خاندان رنگریزوں کا تھا اور تقسیم ہند سے کوئی پندرہ سال پیشتر کشمیر کے بارہ مولہ علاقے سے منٹگمری آگیا تھا جو اب فیصل آباد ہے۔ یہاں انھوں نے کشمیری اونی ملبوسات، شال دوشالوں کا کاروبار شروع کیا۔ بعد میں قالین کی بھی خرید و فروخت بھی بزنس میں شامل ہوگئی۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہاں کا متوسط طبقہ نان جویں اور پیاز کے علاوہ دیگر اشیا کا طلب گار ہوا تو غلام نبی خاں کے بھی خاندان میں پڑھائی کا رواج بڑھا۔

غلام نبی انتہائی ذہین نکلے۔ وہ انجینئرنگ پڑھنے کی خاطر پٹس برگ (Pittsburg) آئے اور فوراً جان گئے کہ پٹرو ڈالروں سے اسلام کی ترویج و اشاعت میں بڑی مدد ملے گی۔ مسجدیں قائم ہوں گی اور بھٹکے ہوئے ''ماڈرن'' مسلمان دین حنیف کی جانب دوبارہ لوٹیں گے۔ لہٰذا وہ پاکستان واپس گئے اور ملتان کے مشہور مدرسے میں چار سال عربی پڑھی۔ انھوں نے قرآن کریم بھی حفظ کیا، احادیث کا گہرا مطالعہ کیا اور فقہ و تفسیر کا درس لیا۔ جدید اور کلاسیکی عربی بولنے کی عادت ڈالی اور پورے ماڈرن مولوی ہو کر امریکہ واپس لوٹے۔

اسی زمانے میں نیویارک کے ایک علاقے میں عالیشان مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ ایک مصری عالم اس کے امام مقرر ہوئے تھے لیکن وہ ضعیف تھے۔ غلام نبی کو بے کھٹکے نائب امام مقرر کیا گیا۔ ایک بھاری بدن کی پنجابی لڑکی سے وہیں ان کی شادی ہوئی۔ متواتر دو فرزند تولد ہوئے، پھر آمد پر پابندی لگ گئی۔ یا تو انھوں نے بیگم کا آپریشن کرا ڈالا، یا خود اپنا (جس کی امید بہت ہی قلیل تھی)، یا پھر حفاظتی تدابیر پر عمل پیرا ہونے لگے۔ شریف حسن سے جدا ہوتے وقت انھوں نے کہا تھا کہ ''شریف صاحب، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں دیکھا کریں، خصوصاً ان کی تفسیر کو، جس کا کوئی جواب نہیں۔''

''لیکن میرے پاس تو مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا ماجد دریابادی کی تفاسیر موجود ہیں۔''

''ہاں وہ بھی اچھی ہیں۔ لیکن سید مودودی کی تفسیر کا جواب نہیں۔''

شریف حسن کار آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے جب گھر لوٹ رہے تھے تو انھوں نے مولوی غلام نبی کی باتوں کو یاد کیا۔ ''مجھے تو شدت پسندی کی بو آتی ہے۔ پتہ نہیں ان حضرات کی بدولت اسلام کا کیا ہوگا۔'' انھیں ایک ساتھ کا لڑکا یاد آیا، جو پل مین میں طالب علم تھا۔ وہ یہودیوں کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔

''ایسا ممکن نہیں۔''

''کیوں؟ کیوں ممکن نہیں؟''

''پہلے آپ امریکہ پر یہودیوں کا جو قبضہ ہے اسے ختم کرائیں۔ ساری دنیا میں ان کا اثر کم ہو جائے گا۔''

''اور اسرائیل کو نیست و نابود کرنا ہوگا۔''

تشدد سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ شریف صاحب نے سوچا۔ راہ وہ ہے جو مولانا مودودی کی حکمت عملی کے ذریعہ نکالی نہیں جاسکتی۔ خلوص، ایمانداری، اخوت، تہذیب اور نیک نیتی میں راہ نجات ہے۔ ہائے میں کیوں بار بار میرا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انھوں نے خود سے پوچھا۔ اللہ نے مجھے اس حرافہ سے نجات دلادی۔ اس سے تو بہت بہتر جوزیفائین اور میری تھیں جنھوں نے ٹوٹ کر میرے جسم کو چاہا۔

(۴)

ہاشمیوں سے چھوٹ کر ایک شاخ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں حجاز سے نکل کر عازم عجم ہوئی تھی اور خراسان کی جانب مڑنے کے بجائے ماژندران کے شمال مغربی خطے میں جا کر بس گئی تھی۔ یہ نیم قبیلہ مکی، نجدی اور خالص قریشی و مطلبی تھا۔ یہ حضرات تلوار کو اتنا ہی عزیز رکھتے تھے جتنا حضرت عثمانؓ کے جمع کردہ مصحف قرانی کو۔ بعد میں انھوں نے صحیحین سے گہرا تعلق پیدا کرلیا اور حضرت امام ابوحنیفہ کے مذہب کو ذریعہ نجات جانا۔ ماژندران میں ان کی خاصی قدر کی گئی۔ وہ شیوخ قریش میں شمار کئے گئے، سیدنا و مولانا کہلائے۔ پھر وہ سر براہان قوم میں شامل ہوئے۔ لیکن ان کی معاش کا ذریعہ قدیم ایرانی کاشتکاران و دہقان جیسا رہا۔ مدتوں بعد جب اصفہان کو فروغ حاصل ہوا، اور مذہب اثنا عشریہ عروج پر آیا، تو اس خاندان کے لوگوں کو جو سید ان ہاشمیان اور شیوخ نجدی کہلاتے تھے مجبور کیا جانے لگا کہ وہ خود کو اثنا عشریہ فرقے میں شامل کرلیں۔

رفتہ رفتہ اس خاندان میں عربی بولنے کا رواج بہت کم رہ گیا تھا، بول چال میں مقامی فارسی کا چلن تھا۔ لیکن ان کی تحریریں عربی تھیں اور تعلیم ساری عربی میں ہوتی تھی۔ ''مقامات حریری'' اور ''دیوان حماسہ'' ان کی نوک زبان تھے۔ ابوالفرج اصفہانی کی ''کتاب الاغانی'' لطف دیا کرتی تھی۔ امام غزالی طوسی کی کتابوں نے تصوف پر غور کرنا سکھایا تھا۔ ابن عربی کی زیادہ تر چیزیں پسند نہ کی جاتی تھیں۔

جب تبدیل مذہب کے سلسلے میں شدت نے زور پکڑا تو اس خاندان نے کوئی ایک ہزار سال بعد ایران کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ سہل نہ تھا۔ سارے علاقے میں خاندان کی دھاک تھی۔ یہ حضرات خالصتاً خدائی لیکن سنی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وحدت ایزدی میں مکمل ایمان رکھتے ہوئے پیغمبروں کے سوا کسی

www.taemeernews.com

اور کو معصوم نہ گردانتے تھے۔ خلافت راشدہ کے چار خلفا کو یکے بعد دیگرے باعتبار فضیلت تسلیم کرتے تھے۔ تبدیل مذہب میں کچھ مشکل نہ تھی، لیکن جناب امیر کو خلیفہ بلا فصل ماننا آڑے آتا تھا۔

جب بادل ناخواستہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ خاندان ماژندران چھوڑ کر اولاً رے اور پھر بصرہ چلا جائے گا، تو یہ بھی طے پایا کہ خاندان کے چند افراد ماژندران ہی میں رک جائیں گے۔ خاندان نے کچھ دن پہلے میر منصور علاء الدین الہاشمی کو ان کے والد سید سماء الدین کی وفات کے بعد شیخ و سربراہ مقرر کیا تھا۔ شیخ مذکور کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ دو خواتین حبالۂ عقد میں تھیں۔ سات اولادیں تھیں، تین بیٹے اور چار بیٹیاں۔ دو دختران ان کا عقد ہو چکا تھا۔ جب قافلہ عازم سفر ہوا تو شادی شدہ دونوں بیٹیاں ماژندران میں رہ گئیں۔ انے والوں میں مرد عورتیں، بچے، ملازمین، سب ملا کر چھیالیس نفر تھے۔ خاندان کے کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قافلہ روانہ اس وقت ہوا تھا جب کہ ہندوستان میں مغل بادشاہ شاہ جہاں اپنے دار الخلافہ شاہجہاں آباد کی تعمیر میں مصروف تھا۔ سارے ملک میں دھن برس رہا تھا۔ گنگا جمنی تہذیب برگ و بار لا رہی تھی۔

قافلہ دھیرے دھیرے چل کر رے پہنچا۔ قافلے کے ساتھ اونٹ، دیگر مویشی، بیل گاڑیاں، اونٹ گاڑیاں، گھوڑے، خچر، اور دس مسلح محافظ تھے۔ عورتیں محافوں میں تھیں، شیخ منصور اور دیگر مرد گھوڑوں پر سوار تھے۔ سمور کی اونچی ٹوپی جس پر طرہ لگا ہوا تھا، انھیں ممتاز کرتی تھی۔ محافظوں اور شیخ منصور کے دبدبے نے قزاقوں کو پاس پھٹکنے نہ دیا تھا۔

رے پہنچ کر چند ہی مہینوں میں کھل گیا کہ یہاں بھی اثنا عشریہ میں شمول کا دباؤ باقی رہے گا۔ حالات سے پیچھا چھڑانا دشوار نظر آ رہا تھا۔

رے میں قافلہ کوئی چھ ماہ رہا۔ مذہبی جھگڑے کے علاوہ بھی مسائل تھے۔ بچے وہاں کی آب و ہوا سے مانوس نہ ہو سکے۔ وہاں کی فارسی پر عربی اثر اب بھی اچھا خاصا تھا لیکن بولنے کا لہجہ ذرا مختلف تھا۔ سب باتوں پر غور کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ بصرہ یا موصل کے بجائے دیار ہند کا رخ کیا جائے۔ تاجدار ہند شاہ جہان صاحب قراں اہل علم پر دولت نچھاور کرتا تھا۔ ہند اسلامی تہذیب کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ ولایت سے آئے ہوئے عالم و فاضل ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے...

[''آپ جانتے ہیں حبیب میاں صاحب،'' شریف حسن ذرا خمار آلود لہجے میں بولے۔ دونوں دوست لذیذ لنچ کے بعد صوفوں پر قیلولہ کر رہے تھے۔ ''میرے اجداد کے فیصلے نے ہمیں ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا۔ اگر میں بصرے میں ہوتا تو ایک ہندی عالم کے ساتھ بیٹھ کر کیوں کر اس میٹھی قوام کی بادۂ لطیف کا مزہ اٹھاتا؟ ہے نا پتے کی بات؟ ہی ہی ہی ہی!'' ''جی ہاں شریف بھائی، قدرت کیسے کیسے کھیل کھیل کر ہمیں بھونچکا کر دیتی ہے۔'']

چنانچہ قافلہ ذرا گھوم کر، اٹک پہنچا جہاں انھوں نے دریائے سندھ کو عبور کیا۔ شاید اسی ندی نے برصغیر کو 'ہندوستان' کا نام دیا ہے، یعنی ایرانیوں کے لئے ندی کی دوسری جانب کے باشندوں کا وطن۔ اس زبردست ندی نے ان پر گہرا اثر ڈالا، اس کی وسعت سے ان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اب وہ ایک نئے خطۂ ارض اور ایک نئے ہی ملک میں داخل ہو گئے ہیں۔ انھیں اس بلاد کی آب و ہوا پرانے ملک سے بہت مختلف لگی۔ کبھی جھکڑ چلا کرتے، کبھی پسینے زیادہ آتے۔ پھلوں پھولوں باغات اور چشموں کی کمی تھی۔ پھر بھی انھیں سارا علاقہ زرخیز دکھائی دیا۔ لوگ ذرا پستہ قد اور سانولے رنگ کے، لیکن، ہر لحہ استقبال کرنے کو تیار، انتہائی خلیق اور خوش مزاج۔

ایک رکن قافلہ نے اپنی یادداشت میں یوں لکھا: ''ہماری خوب خاطر ہوئی، عمدہ گوشت اور عمدہ روٹیاں کھانے کو ملیں۔ یہاں کے والدین ہمارے نوجوانوں سے اپنی بیٹوں کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ آوارگی و اوباشی کہیں نظر نہ آئیں۔ ہاں لٹیرے یہاں بھی ہیں...''

انھوں نے محسوس کیا کہ یہاں عوام میں ایک قسم کی کاہلی، بلکہ کہولت ہے لیکن لوگوں کے اندر کی باتیں سمجھ جانے اور نتائج اخذ کرنے کا ملکہ بھی ان میں خوب ہے۔ انھوں نے بعض ارباب کمال و ہنر میں رعونت اور تعلّی کی کیفیت بھی دیکھی، جو کہ عین ایرانی مذاق کے مطابق تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے کم و بیش ایسا ہی محسوس کیا جیسا کہ دوسرے ان حالات میں محسوس کرتے ہیں۔ جب ایک قوم یا ملک کسی جداگانہ تہذیب کے بنیادی اقدار کو قبول کرتا ہے، یا انھیں اچھا سمجھتا ہے تو اسے یہ فکر چنداں پریشان نہیں کرتی کہ اجنبی نظریات اس کے اپنے نظریات پر غالب آسکتے ہیں۔ سوال فاتح و مفتوح کا نہیں، سوال تہذیب کی ہمہ گیری، لچک، انسان دوستی اور نفاست کا ہے۔

ماژندرانی قافلہ اٹک سے سیدھے ملتان آیا۔ اثنائے راہ میں گرد و غبار کے طوفان، لیکن شہر میں شادابی تھی۔ اشیا سستی تھیں اور وافر تھیں۔ مندروں میں انھوں نے رنگ برنگی مورتیاں، اور پروہتوں کے انبوہ دیکھے۔ عورتیں گیسو پریشان کیے عبادت کرتی نظر آئیں۔ انھیں بتایا کہ یہ عورتیں ہندی ہیں۔ مسلمان عورتیں اگر گھر سے باہر آتی ہیں تو حجاب کی پابندی رکھتی ہیں۔ ہندو مسلمان سب مرد ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھے۔ ہر شخص کا سر ٹوپی یا دستار سے ڈھکا نظر آیا۔ معلوم ہوا اس میں اور مصالح کے علاوہ گرم ریگستانی ہواؤں سے تحفظ کا بھی فائدہ ہے۔ ہاتھ جوڑ کر، اور بزرگوں کے پاؤں چھو کر تعظیم کرنا اچھی لگی۔

انھیں بتایا گیا کہ بعض قومیں (یا قبیلے) چوری، رہزنی اور بدامنی پھیلانے میں مہارت رکھتی تھیں۔ یہ زیادہ تر خانہ بدوش زندگی گذارتی تھیں، لیکن حکام بہت چست تھے اور ان کے پکڑ میں آجانے پر سخت سزائیں دیا کرتے تھے۔

جانوروں کی وہاں کثرت تھی۔ بھیڑیں بہت تھیں۔ افغانستان اور نجد سے درآمد کیے ہوئے دنبے بھی افراط تھے، لیکن افغانی دنبوں کی طرح فربہ نہ تھے۔ گائیں ہر طرف تھیں اور ان کا دودھ، گوشت، کھال، ہڈیاں، سب کام میں آتی تھیں۔ ذبیحہ گاؤ پر پابندی نہ تھی لیکن اکثر علاقوں میں باشندے خود احتیاط کرتے تھے۔ بھینس انھوں نے یہاں پہلی بار دیکھی اور اس کے ڈیل ڈول، طاقت، اور جفا کشی پر متحیر ہوئے۔

www.taemeernews.com

مقامی حضرات نے انھیں صلاح دی کہ وہ دار الخلافہ شاہجہاں آباد جائیں جہاں بادشاہ ایران اور توران سے آئے ہوئے اشراف کی بڑی قدر کرتا ہے، اور اپنی سلطنت کے مختلف علاقوں میں بس جانے کا مشورہ دیتا ہے۔

[" جانتے ہیں آپ حبیب میاں صاحب، یہ ایک دلچسپ اور کارگر طریقہ ہے باہر کے تہذیبی عناصر کو اپنے ملک میں پھیلا کر مقامی تہذیب کی رنگارنگی اور قوت میں اضافہ کرنے کا۔" " جی ہاں، اور اس طور پر سلطنت میں بھی استحکام آتا ہے۔" " ہاہا، اچھی کہی!"]

ملتان سے دہلی کی دوری خاصی ہے۔ اولاً قافلہ لاہور آیا۔ بڑا خوبصورت شہر تھا۔ لوگ اچھے تھے۔ انھیں مسعود سعد سلمان کے اشعار یاد آئے جو اس نے لاہور کی یاد و ثنا میں تا حیات قلم بند کیے تھے۔ مغل صوبے دار نے جب ان کے آنے کا سنا تو قافلے کے سربراہ کو دربار میں مدعو کیا۔ شیخ منصور کی ناسازی طبع کی وجہ کر شیخ کے دوسرے صاحبزادے میر قیام الدین محمد کرم اللہ دربار میں تشریف لائے، مناسب نذر پیش کی اور خلعت و انعام سے مخلع کیے گئے۔

میر موصوف کی وجاہت و علمیت سے متاثر ہو کر لاہور کے قلعہ دار فضل اللہ خاں جمالی انھیں دربار کے بعد اپنی حویلی میں لے گئے۔ حسن اتفاق کی اسی وقت قلعہ دار کی مخدرات کہیں سیر کے بعد واپس آرہی تھیں۔ محافے صدر دروازے پر لگے ہوئے تھے، کوچہ سلامت تک سراپردہ کھنچا ہوا تھا۔ لیکن لاہور کی ہوائیں، الاماں۔ اک تند جھونکا، اور سراپردہ کا ایک ٹکڑا لڑ کھڑا اٹھا۔ فضل اللہ خاں جمالی کی چھوٹی بیٹی ثمینہ بانو نے اس وقت محافے سے پاؤں نکالا ہی تھا کہ پردہ اٹھا اور پھر برابر کر دیا گیا۔ نازک نازک پاؤں، اس میں کاشانی مخمل کی جوتی، تلوے اور ٹخنے نگار سے رنگین۔ ادھر قلعہ دار بہادر کا ہاتھی صدر دروازے پر منتظر تھا کہ محافے ہٹیں تو فیل نشینوں کے لئے جگہ بنے۔ ثمینہ بانو کی بس ایک جھلک نے قیام الدین کے قلعہ دل کی فصیل کو مسمار کر دیا، سارا قیام و قرار رخصت ہوا۔ ہر چند کہ بات تہذیب سے پرے تھی لیکن بیٹے کے برے حال دیکھ کر شیخ نے مشاطاؤں کے ہاتھ رقعہ بھجوا ہی دیا۔

فضل اللہ جمالی ہر چند کہ مذہب امامیہ رکھتے تھے، لیکن یہ دیار ہند تھا، یہاں وہ تعصبات نہ تھے۔ اور پھر ایسا جلیل القدر گھرانہ۔ بات فوراً پکی ہوئی، صوبہ دار پنجاب کی اجازت لے کر عقد کی رسم سادہ طور پر ادا کر دی گئی اور طے پایا کہ فی الحال میر قیام الدین خانہ داماد بن کر لاہور میں قیام کریں گے۔ کوئی ایک ماہ کی ضیافتوں اور ملاقاتوں کے بعد میر منصور کا قافلہ دار الخلافہ شاہجہاں آباد کے لئے روانہ ہوا۔

جب قافلہ دہلی کے نواح میں داخل ہوا تو سب کے دل سے آفریں نکل گئی۔ ایسا وسیع و زبردست شہر انھوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ شہر پناہ مستحکم تھی، شہر کے دروازے بلند اور محفوظ، لیکن مسافروں اور تجار و اہل ہنر کا ہجوم بے پایاں۔ عسکری جگہ جگہ متعین، کوتوال شہر کی نفری الگ۔ کسی کو چوں کرنے کا یارا نہ تھا۔ سارا شہر آئینے کی طرح پڑا چمک رہا تھا۔ شہر کے باہر انھوں نے مختلف قوموں اور اہل حرفہ کے ٹھکانے دیکھے۔ وہ کام کرنے علی الصبح شہر میں داخل ہوتے اور سرِ شام گھروں کو لوٹ جاتے۔ غلے، مویشی، پھل، ترکاری، پھول پات، گھی گوشت، اور دیگر ضروریات زندگی کی بہتات تھی۔ تمام دنیا کا مال چاندنی چوک کی دکانوں میں پٹا پڑا تھا۔ دریائے جمنا کے کنارے ایک مرتفع ٹیلے پر سنگ سرخ کا قلعہ، آسمان سے باتیں کرتی ہوئی فصیل قلعہ اور چاروں طرف گہری خندق، اس پر جگہ جگہ لکڑی اور لوہے کے پل۔ چوبیس گھنٹے نوبت بجتی ہوئی، کہ یہ صاحب قران شہاب الدین محمد شاہجہاں کا محل ہے۔ (لطف کی بات یہ کہ عوام اسے 'حویلی' کہتے تھے۔) قلعے کے سامنے سعد اللہ خان کا چوک، کہ شیراز و اصفہان کے سارے بازاروں کی رونق اس کے سامنے ہیچ تھی۔ سامنے جامع مسجد، عجائبات عالم میں سے ایک عجائب، کہ اصفہانی مسجد کی شوکت و شان اس کے سامنے پھیکی معلوم ہوتی تھی۔ چاندنی چوک کے دو طرفہ امرا اور رؤسا کی عالیشان حویلیاں تھیں۔ لوگ خوش پوش و خوش اخلاق تھے۔

ماژندران سے نکل کر ہاشمیوں کا یہ قافلہ کوئی ایک سال بعد دہلی پہنچا تھا۔ طویل سفر اور افکار زمانہ کی وجہ کر شیخ منصور کی طبیعت ناساز رہا کرتی تھی۔ انھوں نے گھرانے کی سربراہی کی زیادہ تر ذمہ داری بڑے لڑکے میر فضل الدین محمد ظفر اللہ کے حوالے کر دی تھی۔ میر فضل الدین اتفاق سے اب تک کنوارے تھے۔ بلا کے ذہین اور مردم شناس، علم و کمال اس پر مستزاد۔ عربی اشعار فی البدیہہ کہتے تھے۔ فقہ و تفسیر و حدیث میں منتہی تھے۔ آثار ایسے تھے کہ میر فضل الدین آگے چل کر نامور ہوں گے۔ اور یہاں شاہ جہاں آباد میں تو ان کی ترقی کے امکانات اور بھی وسیع تھے۔ یہ حضرات محرم ۱۰۷۰ (۱۶۵۹) میں دہلی وارد ہوئے تھے۔ گرمیوں کا آغاز ہو رہا تھا اور مغرب سے گرد و غبار کا طوفان سارے شہر کو نرغے میں لینے والا تھا۔

جب ہاشمی ماژندرانی خاندان دہلی آیا تھا تاجدار ملک زیادہ تر اپنے نوتعمیر دار الخلافہ شاہجہاں آباد میں رہا کرتا تھا۔ شاہان مغلیہ جھروکے پر بیٹھ کر درشن دیا کرتے تھے۔

" یہ کون سا طریقہ ہے برادر من؟" شیخ منصور نے ایک ملاقاتی سے دریافت کیا تھا۔

" یہ طریقہ صاحب قراں کے دادا خلد آشیانی حضرت جلال الدین اکبر بادشاہ نے رائج کیا تھا۔"

" غالباً قدیم ایران میں بھی ایسی کوئی رسم تھی۔ لیکن اس سے فائدہ کیا متصور ہو سکتا ہے؟"

" ظل الٰہی عالم پناہی اس طرح اپنی رعایا سے روحانی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ دیکھنے سے طرفین میں توجہ بڑھتی ہے۔"

" ہوں، ممکن تو ہے۔"

میر فضل الدین نے اس مسئلے پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بادشاہ وقت کئی اعتبار سے رعایا کا باپ اور اس کا مرشد ہوتا ہے۔ وہ سب سے مصافحہ نہیں کر سکتا لیکن جلوہ دکھا کر خوش تو کر سکتا ہے۔

www.taemeernews.com

۶

عاشقاں وحدت کے دریا پار ہیں

خیرخواہان نے شیخ منصور کو صلاح دی کہ شہنشاہ فلک بارگاہ کے دربار دیوان عام میں باریابی کی درخواست کریں۔ صاحبقراں کی ترقی ملک و مال، صحت و تندرستی اور استحکام سلطنت و سرفرازی خدام عالی کے لئے دعائے سحر گاہی کریں۔ اس لئے دربار میں حاضری لازمی تھی۔ صوبہ دار لاہور کے وکیل رائے گردھر داس شہابی کے توسط سے سعد اللہ خان وزیر الممالک کی بارگاہ تک رسائی ہوئی۔ پھر وہاں سے آستانہ عاں کے قدم تھا۔ سعد اللہ خان نے مہمان گرامی کی ذاتی و خاندانی وجاہت کے پیش نظر ان کی پرتپاک آؤ بھگت کی اور استدعا کی کہ جب تک آستانہ فلک نشاں سے اشارہ نہ مل جائے، شیخ اور ان کے لواحقین جہان آرا بیگم کی سرا میں شاہی مہمان رہیں۔

وزیر الممالک نے کوتوال دہلی کو حکم دیا کہ شیخ اور ان کے متوسلین کی پوری کیفیت خفیہ طور پر جانچی اور بیان کی جائے۔ ضروری پڑتال کے بعد کوتوال نے توقیع لکھی کہ یہ خاندان نجیب الطرفین سید ہے۔ علم و فضل میں یہ لوگ ممتاز ہیں۔ کسی امر دینادی سے کچھ لگاؤ نہیں۔ عبادت، تسبیح و استغفار، زکوٰۃ و صدقہ و خیرات اور درس و تدریس کے سوا ان کا کچھ مشغلہ نہیں۔ یہ حضرات ماژندران کے مذہبی مناقشات سے گھبرا کر اعلیٰ حضرت جہاں پناہ کے لوائے عاطفت تلے امن و سکون ڈھونڈنے حاضر ہوئے ہیں۔ اللہ والوں سے ملتے ہیں عوام کو دینی تعلیم دیتے ہیں۔ شیخ کے بڑے صاحب زادے میر فضل الدین طبع سلیم و ذہن ذکی رکھتے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے قلعہ دار لاہور کی دختر کو منسوب ہیں لیکن ان میں، یا خاندان کے کسی فرد میں، رفض کی طرف کوئی رجحان نہیں۔

ان اطلاعات کی روشنی میں نواب سعد اللہ خان نے آستانہ جہاں پناہی میں دیوان عام کے دن شیخ منصور کے لئے دربار میں حاضری کا اذن حاصل کر لیا۔ شیخ منصور آگے آگے، میر فضل الدین اور میر قیام الدین (جو دربار میں حاضری کے لئے بطور خاص لاہور سے طلب کیے گئے تھے) ان کے دو قدم پیچھے۔ شیخ اور ان کے بیٹوں کو بادشاہ کے دائیں جانب درجہ سوم کے امرا میں جگہ ملی۔

جب درجہ سوم کے امرا سے تخاطب کی باری آئی تو سعد اللہ خان نے ایک مختصر محضر پڑھ کر سنایا جس میں شیخ منصور کے حالات تھے۔ اس کے بعد اس نے تخت کا پایہ چھو کر کہا:

"عالی جاہا، عالم پناہا، شیخ منصور اور ان کے لائق بیٹے بندگان آستانہ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہیں۔"

بادشاہ کی طرف سے ہلکا سا اشارہ ہوا، چوبدار نے آگے بڑھ کے شیخ کی آستین کو ہلکے سے چھوا، شیخ نے وہیں سے تین سلام کیے، نذر معمولہ پیش کی۔ چوبدار نے نذر کی کشتی امیر حاجب کو پیش کی، اس نے اسے تخت کے پاس لا کر شاہ گیتی پناہ کے قدموں میں رکھنے کا اشارہ کیا ہی تھا کہ بادشاہ نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر نذر کی کشتی کی قبولیت کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی شیخ منصور کو چودہ پارچے کا خلعت مع سرپیچ و مالائے مروارید، اور صاحب زادگان کو نو پارچے کے خلعت مع سات رقوم جواہر پیش کیے گئے۔ شیخ نے مالا گلے میں ڈال لی، باقی سامان کو سر پر رکھا، پھر اسے بیٹوں کے حوالے کر کے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، سر کو قدموں کی طرف جھکایا اور گویا ہوئے:

"ہماری مجال و طاقت کیا جو صاحب قران اعظم، سلطان ابن سلطان ابن سلطان، خاقان زمن فرمانروائے ہند و دکن، حضرت شہاب الدین شاہجہاں خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کی توصیف و شکریے میں کچھ کہہ سکیں، یہی عرض کرتے ہیں کہ ظل الٰہی کے سائے کو بوسہ دیتے ہیں۔ ہم معمولی فقیر ہیں، شاہ گیتی پناہ کی سلامتی اور استحکام و استقلال سلطنت کے لئے صبح و مسا دعا گو ہیں۔ ملتمس ہیں کہ ہمیں حضرت والا اقبال کی بسیط مملکت کے کسی گوشے میں سر چھپانے کی جگہ مل جائے کہ حیات مستعار کے بقیہ دن یاد الٰہی اور آں حضور کی درازی عمر و دولت و اقبال میں گذار دیں۔"

بادشاہ گویا ہوا۔ "شیخ ہم چاہتے ہیں کہ آپ خطہ مشرق کو جائیں۔ وہاں آپ کا خاطر خواہ انتظام ہو جائے گا۔ شیخ فضل الدین کچھ دن تک ہمارے مہمان رہیں گے۔"

شہزادہ دارا شکوہ نے بادشاہ کی طرف ملتمس نگاہوں سے دیکھا، گویا کوئی بات یاد دلا رہا ہو۔ صاحب قراں کے چہرے پر بہت خفیف سی مسکراہٹ آئی، گویا ارشاد فرما رہے ہوں کہ ہم کبھی کچھ بھولتے نہیں۔ شہزادہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا، پہلے اس نے حضور سرور کائنات، پھر شیخین، پھر حضرت عثمان غنی، اور پھر حضرت علی کی ثنا میں چند کلمے فصیح عربی میں کہے، پھر شیخ کے لئے خیر مقدمی کلمات فارسی میں ادا کر کے ایک لحظہ بھر چپ رہا۔ شاہ جمجاہ کی آنکھ اپنی طرف دیکھ کر شہزادے نے پھر لب کشائی کی اور دونوں کے درمیان پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:

دارا شکوہ: یا شیخ، کیا سارے انسان برابر ہیں؟

شیخ: جی نہیں۔ جو تقویٰ میں افضل ہے وہ سب میں افضل ہے، لیکن اس کے سوا بزرگی کوئی اصل نہیں۔ حضور سرور کائنات کا ارشاد ہے کہ افضلیت کی بنا رنگ یا نسل پر نہیں۔

دارا شکوہ: تو پھر انسانوں کے درمیان مذہبی تفریق کیوں ہے؟

شیخ: یہ سراسر خود انسانوں کی غلطیوں اور کوتاہ بینی کے باعث ہے۔

دارا شکوہ: یعنی؟

شیخ: جب پیغمبر اسلام نے اللہ کے حکم سے اعلان کیا تھا کہ دین مکمل ہو گیا، تو پھر ہر انسان کا فرض تھا کہ وہ دار الاسلام میں داخل ہو جائے۔ لیکن آپ نے یہ اعلان نہیں فرمایا جو اسلام سے دور ہے اس کے حقوق پامال کیے جائیں۔ لیکن جو منکر ہیں اور اسلام کی رسی کو پکڑنا نہیں چاہتے ان کی سعادت کے اور بخشائش کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے، سوا اس کے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔

www.taemeernews.com

دارا: لیکن وہ بھٹکے ہوئے لوگ جو اپنے شعور کے مطابق سیدھی راہ پر چل رہے ہیں؟

شیخ: حضرت صاحب عالم، انتہائی ادب سے عرض کرتا ہوں کہ اسلام نے ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ پیغمبر آخر الزماں نے ہم کو اس طریق پر چلنے کے بھی طریقے بتا دیے ہیں۔ اسی صراط مستقیم پر چل کر فلاح دین و دنیا ہے۔ اب رہا معاملہ دوسروں کا، جو اپنے شعور کے مطابق اپنی روایت پر عامل ہیں، ان کے عقائد یا اعمال پر بحث کرنا ہماری نجات کا سبب نہیں بن سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں سب کو مخاطب کیا ہے اور دعوت غور و فکر دی ہے۔ جو شخص ایمان بالغیب رکھے اور خدا کو حاضر و ناظر جانے اس کا شرح صدر بھی ہوگا۔ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

دربار سے واپسی کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد اودھ کے اس علاقے میں جو گومتی، گنگا اور سرجو ندیوں سے سیراب تھا اور جہاں کی زمین انتہائی زرخیز تھی، اور مقدس ندیوں کے پانی نے جہاں کے عوام کی بولی کے میں ایک محبوب مٹھاس پیدا کر دی تھی، فرمان شاہجہانی کے ذریعہ سے ایک جاگیر، بلگرام سے ذرا دور، اور سندیلہ قصبہ سے ملحق، شیخ منصور کو عطا کی گئی۔

یہ بڑا سرسبز علاقہ تھا۔ مرغزاروں، قطعات جنگل، تالاب و چترہ، ہر طرف ہرے بھرے۔ جنگلی جانوروں کی بہتات تھی، غلہ وافر پیدا ہوتا تھا۔ رعایا فرماں بردار تھی۔ اس جگہ کا پرانا نام "دور سندیلہ" تھا۔ رفتہ رفتہ اسے "منصورہ" کہا جانے لگا۔ پھر سرکاری کاغذات میں بھی اسی نام سے لکھا پڑھی ہونے لگی۔ جب انگریزی عملداری کا آغاز ہوا تو یہ علاقہ منصورہ پرگنہ، اور بعد میں منصورہ اسٹیٹ کہلایا۔

(۷) تمھارا دل سلامت، تمھاری جاں سلامت

"بھئی حبیب میاں صاحب، آپ کل ییل (Yale) جا رہے ہیں۔

میں بھی کل سے بہت بزی ہو جاؤں گا۔ میں چاہتا تھا، آپ مزید چند دنوں قیام کرتے۔ میں آپ کو نیویارک پبلک لائبریری لے جاتا۔ کتابوں کے درمیان رہ کر کتنی مسرت ہوتی ہے! کسی اور چیز سے ایسی مسرت بھلا کہاں حاصل ہوتی ہے؟"

"نہیں شریف بھائی ایک اور شے ہے۔"

"کیا؟"

"آپ تو خوب جانتے ہیں۔"

"اچھا... اچھا! ہو ہو! مگر بھئی وہ جسمانی لطف ہے۔ کتابیں روحانی لطف دیتی ہیں۔"

"شریف بھائی، کیا جسمانی اتصال سے روح کو بالیدگی حاصل نہیں ہوتی۔ جنسی اختلاط کیا سعادت کی منزل تک نہیں لے جاتا؟"

"جی... میاں صاحب۔ میں بھی پہلے کچھ یہی سوچتا تھا۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں، شاید سقراط نے بھی اس جانب اشارہ کیا ہے۔ جنسی مقاربت سے اگر روحانی غذا کبھی دستیاب بھی ہوئی ہے تو بڑی تگ و دو کے بعد۔

کیفیوشس کو پڑھ کر، یا کعبے کا طواف کرنے پر جیسا انبساط ہمارے سارے قلب و روح کو سرشار کر دیتا ہے، عورت سے قربت ویسا سرور و لطف اور عالم جذب و کیف پیدا نہیں کرتی۔ کم سے کم میرا تو یہی تجربہ ہے۔"

"آپ نے حج تو کیا نہیں ہے۔"

"کنفیوشس کو تو پڑھتا رہا ہوں۔"

"آپ نے ابھی خواہشات کی بات کہی تھی۔ میٹھی چیزوں سے میری رغبت بہت کم ہو گئی ہے، خصوصاً آئس کریم سے۔"

"میں آپ کو ایک قصہ سناؤں۔ آپ کو بتا چکا ہوں کہ پلمین میں میری دوست جوزیفائن نامی لڑکی تھی۔ پھر وہ چلی گئی، اور میں تنہا رہ گیا۔ کچھ دن کے اندر ایک مرد قسم کی لمبی تگڑی لڑکی مارتھا ہافمن کے نرغے میں پھنس گیا۔ یہ لڑکی خوب چاکلیٹ کھاتی اور کوک پیا کرتی تھی۔ تیسرا شوق اسے آئس کریم کھانے کا تھا۔ اس نے مجھے اس قدر آئس کریم کھلا ڈالی کہ میں نے بعد میں آئس کریم کھانی تقریباً بند کر دی۔ میں آپ کو خوب گاڑھی میٹھی کریم میں چاکلیٹ اور چند میوہ جات ملا کر کھلانا چاہتا تھا۔ اگر اس میں تھوڑی رم ملا کر نوش کریں تو انسان عالم بالا کو پہنچ جائے۔"

"نہیں، شریف بھائی میں رم سے بہت گھبراتا ہوں۔"

"کیوں بھئی؟ کوک میں رم ملا کر ورجینا وولف کو پڑھیے، لگتا ہے وہ خود کہانی سنا رہی ہے۔"

"میری ذرا سن لیں شریف بھائی۔ میں ایک بار ایک پارٹی میں گیا کرسمس کا زمانہ تھا۔ کمرہ کھچا کھچ بھرا تھا۔ لوگ محو رقص تھے۔ ایک لمبی سی میز پر کھانے کی کچھ چیزیں اور ایک بڑے منہ کے برتن میں کاک ٹیل تھی۔ بتایا گیا کہ محض پھلوں کا عرق ہے۔ میں نے ایک گلاس پیا، بہت لطف آیا۔ پھر دوسرا، اور ایک کرسی پر آن کر بیٹھ گیا۔ ایسا لگا کہ ہوش رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنی نگاہیں رقص کرتے ہوئے جوڑوں پر مرکوز کیں... اتنے میں ایک صاحب زادی... صاحب زادی کیا ایک توانا خاتون، سینہ نصف کھلا، ہونٹ پر لپ سٹک پتی ہوئی، میرے پاس آئیں اور ڈانس کرنے کو کہا۔ مجبوراً میں اٹھا۔ صاحب کیا بتاؤں پاؤں پھسل سے رہے تھے، جیسے برف پر پھسلتے ہیں۔ وہ مجھ سے لپٹ کر رقص کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر سر اٹھایا میرے کان تک منہ لائی اور بولیں:

Let's go somewhere.

شریف بھائی، ایسی کیفیت میں میں کیا کر سکتا تھا، قوم کا نام بدنام کرتا، خوار و ذلیل ہوتا۔ میں ٹال مٹول کرتا رہا، آخر انھوں نے میرا پنڈ چھوڑا۔ اور میں ایک صوفے پر آن کر ڈھیر ہو گیا۔ پتہ چلا کہ کاک ٹیل میں رم کی خاصی مقدار ملائی گئی تھی۔"

شریف حسن مستقل ہنستے چلے گئے۔ "ہا ہا... ارے بھئی حبیب میاں صاحب آپ یہ بتائیں کہ لطف آیا کہ نہیں؟... اور اگر آپ اس موٹی تازی خاتون کی

www.taemeernews.com

خدمت کر دیتے تو مزید مزہ آتا۔ بھئی ایسے موقعوں پر آنکھیں بند کر خدائے رحمٰن رحیم سے خواستگار معافی ہو کر لطف و سرور میں ڈوب جانا چاہیے۔"

[شریف حسن صاحب کی بابت حبیب میاں صاحب کے روزنامچے سے چند اوراق شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی جانب رجوع کر کے ان امریکہ مقیم ماڑندرانی کے کوائف معلوم کیے جا سکتے ہیں۔]

(۸) رہیں ہم تمھارے یہی آرزو ہے

"حبیب میاں صاحب، میں نے اپنے خاندان کے سلسلے میں خوب غور کیا ہے۔ جب میں سندیلے کے انٹر کالج میں پڑھتا تھا تو میری عادت تھی کہ پرانے بوسیدہ کاغذات اور کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھوں۔ ہم زمیندار تھے۔ ہماری کورٹ یا کچہری لگتی تھی۔ ضروری کاغذات وغیرہ الماریوں اور بکسوں میں مقفل رہتے تھے۔ ایک ضعیف سے منشی کریم الدین پلنگ پر دوپہر میں لیٹے حقہ گڑگڑایا کرتے تھے۔ میں ان سے چابیاں لیتا، کاغذات دیکھ کر احتیاط سے واپس رکھ دیا کرتا۔

مجھے ہمیشہ سے تمنا رہی کہ جانوں کہ ہم کون ہیں، اور یہاں اس پر فضا مقام پر کیوں رہتے ہیں۔ جہاں جاں بخش ہوائیں ندی سے ہو کر ہمارے یہاں آیا کرتی ہیں۔ پرانے کاغذات کا دیکھنا صبر آزما کام تھا۔ زیادہ تر اوراق فارسی میں، اور پھر پرانی انگریزی میں تھے۔ کبھی کبھی شکستہ حروف میں اردو کے جملے بھی مل جایا کرتے تھے۔ بہت ساری باتیں حافظے سے نکل چکی ہیں، لیکن کاغذوں کو پڑھ کر پتہ چلا کہ ہم نجیب الطرفین سید ہیں۔ ہمارے خاندان میں زیادہ تر شادیاں قرابت میں ہوئیں۔ ایک بزرگ خاتون پھوپی، خالہ اور نانی ہوا کرتی تھیں۔ میرے دادا کی شادی خالہ زاد بہن سے ہوئی۔ میری والدہ والد مرحوم کی پھوپی زاد بہن اور خالہ بھی ہوتی تھیں۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس آپسی قرابت نے نہ تو ہمیں ذہنی طور پر کمزور کیا اور نہ جسمانی طور پر چھوئی موئی بنایا۔ ہم چاروں بھائی مستعد، چوکس اور بالغ نظر رہے ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ ہمارے ہاں کی خواتین عموماً چالیس کی عمر کے بعد قلب کی بیماریوں میں مبتلا ہو جایا کرتی تھیں۔

ہمارے خاندان کو منصورہ میں بسائے جانے کے کئی سال بعد اورنگ زیب نے باپ کو معزول کر دیا۔ وہ خود انتہائی مذہبی حکمراں تھا، لیکن رفتہ رفتہ ہم لوگ مذہبی نہ رہ گئے۔ نوابان اودھ کا دور گذرا تو ہم خود نواب بن گئے۔ لیکن ہمارے خاندان میں طمع و ہوس کا بول بالا نہیں ہو سکا۔ شاید شیخ منصور کی روح نے ہمیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ ہمارے اجداد تفریح طبع کے لئے کوٹھوں پر ضرور جایا کرتے تھے اور انھیں اپنے یہاں بلوا بھی لیا کرتے تھے لیکن انھوں نے ان میں سے شادی کبھی نہیں کی۔ داشتہ بنا کر رکھنے کی بات اور ہے۔ ہماری خواتین سادہ مزاج، مذہبی اور بچوں سے گہری محبت کرتی تھیں۔"

"شریف بھائی، آپ کے خاندان کی زمین تھی کتنی؟"

"ارے بھئی، قدیم وقتوں میں ساری پیمائش تخمینی ہوا کرتی تھی۔ اندازہ ہے کہ جاگیر پانسو بیگہ سے زائد تھی۔ پانچ باغات تھے، دو تالاب۔ سردیوں میں بطخیں، سرخاب، قازیں وغیرہ خوب گرا کرتی تھیں۔ سارس بے شمار آتے تھے۔ کھیتوں میں نیل گائیں گھوما کرتی تھیں۔ کٹائی کے دنوں میں مختلف قسم کے ہرنوں کی ڈاریں کھلیانوں تک آ جاتی تھیں۔ ۱۸۵۷ کے بعد برٹش سرکار نے قلعے کا باہری حصہ توپ سے اڑا دیا گیا۔ دروازے پر ہاتھیوں کا جھولنا بند ہو گیا۔ برچھی بردار، قرابین بردار، موقوف کر دیے گئے۔ صرف چند سپاہی، پیادے اور بندوقچی رکھنے کی اجازت ملی۔ علاقہ کوئی ڈھائی سو بیگھے رہ گیا۔ لیکن برٹش گورنمنٹ سے جو کاغذات آتے تھے وہ "نواب منصور" کے نام ہوتے تھے۔

آزادی ملی تو زمینداری ختم ہو گئی۔ کوئی پچاس بیگھے خود کاشت کے طور پر رہ گئے اور باغات و تالاب۔ حویلی کے پیچھے سبزیوں کی کاشت ہوتی تھی وہ رہ گئی۔ بھائی میرے حبیب میاں صاحب، تقسیم نے ہندوستان کے مسلمان کا شیرازہ بکھیر دیا۔ تہذیب مٹ گئی، ہزار ہا ہزار قلمی کتابیں ضائع ہو گئیں، تصویریں، قالین، فرش فروش، شیشہ آلات، تتر بتر ہو گئے۔ اور شمالی ہند کے اشراف مسلمانوں کے لئے تو سارا علاقہ غدر کے بعد کی دہلی بن کر رہ گیا۔"

"شریف بھائی اب رونے سے کیا حاصل؟"

"میں اپنے لئے نہیں رو رہا ہوں۔ میں اس تہذیب کا ماتم کر رہا ہوں جسے شمالی ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے بڑے جتن اور بڑے چاؤ سے مدتوں میں پیدا کیا تھا۔ ایسی فعال اور رنگا رنگ تہذیب کے لئے ہی کہا گیا کہ پھرتا ہے فلک برسوں۔"

"جاگیردارانہ نظام میں بہت سی خرابیاں بھی تو تھیں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"خرابیاں ضرور تھیں۔ یاد رکھیں میں اس نظام کے حمایتوں میں سے نہیں ہوں۔ میں تو سیدھا سادا ماڈرن انسان ہوں جو جمہوری نظام کو بہترین سمجھتا ہوں۔ لیکن آپ دیکھیں کہ یہ جاگیردارانہ نظام کس قدر دیرپا ثابت ہوا۔ امن و امان کم و بیش قائم رہا۔ قحط کے دنوں کے علاوہ مزدور کسان بہت کم بھوکوں مرتے تھے۔ سرمایہ داری نظام تو لوٹ کھسوٹ پر قائم ہے۔"

"آپ حضرات جہاں سے وارد ہند ہوئے تھے وہ جگہ تو خاصی مختلف تھی۔ ہندوستان نے آپ لوگوں کو بہت پریشان کیا ہوگا؟"

"ارے بھائی حبیب میاں صاحب ہم مشرق میں جم کر بیٹھے ہی تھے کہ شاہ جہاں کے بیٹوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اورنگ زیب عالم گیر حاوی رہا۔ اس نے صاحب قران کو معزول کر دیا۔ عالم و فاضل دارا شکوہ قتل ہوا۔ لیکن نئے بادشاہ نے قدیم احکام اور معافیوں کو کم و بیش جاری رکھا۔ شیخ منصور میر افضل الدین کو نئے شاہ کے دربار میں بھیجا کہ نئے نظام سے صلح صفائی قائم رہے۔

اس زمانے میں ہمارے علاقے میں انسانی آبادی کم تھی۔ سانپ اور بچھو بکثرت تھے۔ موذی عقارب کا ذکر بار بار آیا ہے۔ کئی بچے اور چھوٹے جانوران کے کاٹنے سے ہلاک ہو گئے۔ سانپ بھی بکثرت تھے۔ بلکہ میرے ہوش تک قصبے سے باہر سپیروں کی بستی تھی۔ جن کی عورتیں دل پھینک واقع ہوئی تھیں۔"

www.taemeernews.com

''شریف بھائی آپ ہمہ وقت شہوات کی کارستانیوں کی جانب لوٹتے ہیں!''

''بھائی میرے کیا کروں زیست چند روزہ میں یہی اہم ترین شے ہے۔ کیا کیا طبع آزمائیاں نہیں ہوئی ہیں، خدا کی پناہ!''

''معاف کریں مجھے شریف بھائی میں نے دخل در معقولات کیا۔''

''دیکھو میرے میاں صاحب میں اپنے خاندان کے متعلق دو تین ہزار صفحات کی کتاب لکھ سکتا ہوں۔''

''تو پھر لکھ ڈالیں اے ماڈرن ابن خلدون، یا ایڈورڈ گبن!''

''استادم خم کہاں! اتنی لگن کہاں! اندام نہانی پر کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں۔''

شریف حسن یک بیک اٹھے، کچن میں گئے اور ایک کین سائڈر (Ciden) کو اٹھا لائے۔

''آئیے جناب ذرا خود کو تر و تازہ کریں۔''

کمرہ خوب گرم تھا اور حبیب میاں صاحب کا گلا خشک ہو رہا تھا۔

(۹)

شریف حسن جب واشنگٹن اسٹیٹ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے تو ایک سنہری بالوں نیلی آنکھوں والی زہرہ جبیں سے دوستی ہوگئی۔ وہ دوست بنی، محبوبہ بنی، جذبۂ عشق کی آئینہ بردار بنی۔ جوزیفائن نے شیری کو ہم بستری کی کیف آور ترا کیب وطرق سے روشناس کیا پھر انھیں چھوڑ کر کیلی فورنیا چلی گئی۔ شریف میاں پھر تنہا رہ گئے۔ جوزیفائن نے انھیں شربت وصل کا عادی بنا دیا تھا۔ کچھ دن وہ گردن کٹے مرغ کی مانند بوکھلائے پھرے۔ چند حسیناؤں کی جانب نظروں کے تیر چلائے، وہ صرف مسکرا کر رہ گئیں۔ پھر ذرا استقامت آئی۔

یونیورسٹی میں ان دنوں ایک جرمن نژاد لڑکی پڑھا کرتی تھی۔ لمبی چوڑی، تگڑی، بال اتنے ہلکے رنگ کے کہ Platinum Blonde کا شک گذرے۔ آنکھیں ہلکی سبز، کرخت چہرہ۔ اس کی رگوں میں کئی قوموں کا خون جوش مار رہا تھا۔ پہلوان پیکر دادا پٹس برگ سے مونٹینا (Montana) لکڑی کی تجارت کرنے آیا۔ قسمت کا دھنی تھا، کاروبار میں خوب منافع ہوا۔ بیٹا باپ سے بڑھ کر تجارتی نکلا۔ اس نے ایک سپر مارکیٹ کھول لی۔ دولت کی ریل پیل ہوگئی۔ مارتھا کے بارے میں مشہور تھا کہ ایک ہفتے کے اندر تین ترنگے جوانوں کی خدمات طلب کرتی تھی۔ اس نے کیمپس میں کئی بار شریف حسن کو سر جھکائے چلتے دیکھا تھا۔ جانتی تھی کہ اس کی ایک اسٹیڈی گرل فرینڈ (Steady girl friend) ہے۔ جب وہ رفو چکر ہوگئی تو اسے افسوس سا ہوا۔ یوں لڑکا قابل تفتیش تھا۔

ایک دوپہری کا ذکر ہے۔ شریف میاں لائبریری میں میز پر ڈھیری کتابیں رکھے مصروف مطالعہ تھے کہ مارتھا آن نکلی۔ میز کے سامنے کھڑی ہوگئی، اور ہلکے سر میں بولی: ''کین آئی "Can I?"؟''

شریف حسن اپنی کرسی سے ذرا اٹھے، اور شریفانہ لہجے میں بولے:

''پلیز!''

مارتھا نے سامنے کی کرسی پر اپنا بھاری کوٹ پٹکا، میز پر وزنی بیگ رکھا اور دوسری کرسی پر دھم سے بیٹھ گئی۔ شریف خاموش رہے، اپنے کام میں مصروف۔ مارتھا نے بیگ کھول کر ناخن کو ہموار کرنے کی ریتی نکالی۔ ناخن کو رگڑنا شروع کیا، اور پھر اسی ہلکے سر میں بولی: ''ہائے! (Hi!)''

شریف میاں نے سر اٹھایا۔ کرخت سا چہرہ تھا، مگر آنکھیں محو خواب کر دینے والی، ہلکے سے بولے: ''ہیلو!''

''تم ہندوستانی ہو؟''

''ہاں۔''

''میں انڈیا جانا چاہتی ہوں۔''

''جائیں، ضرور جائیں۔ کوئی پابندی نہیں۔''

وہ ذرا ہنسی، بولی: ''اکیلے کیوں کر جاؤں؟''

''ہزاروں جاتے ہیں۔''

وہ اس بار ذرا زور سے ہنسی: ''یہ بھی کوئی وقت ہے پڑھنے کا؟''

''مجھے ایک پیپر لکھنا ہے۔''

''بعد میں لکھ لینا۔ چلو گھومنے چلتے ہیں۔''

مارتھا نے اپنی کار ذرا دور کھڑی کر رکھی تھی۔ ہلکی ہلکی برف گر رہی تھی۔ فورڈ کی مسٹینگ (Mustang) کار یخ بستہ ہو رہی تھی۔ مارتھا نے ہیٹر چلا دیا کر دیا۔ دونوں سکڑ کر بیٹھے رہے۔ جب کار سڑک پر آئی، تو شریف حسن نے ڈرائیور کی کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہا:

''چپ چاپ بیٹھے رہو۔ دیکھتے نہیں سڑک پر پھسلن ہے۔''

کچھ دیر کے بعد مارتھا نے کار دوسری سڑک پر موڑ دی اور ایک مناسب جگہ پر روک کر یک بیک شیری کی جانب پلٹی۔ شریف حسن تو منتظر ہی تھے۔ جب ان کا تنفس تیز ہونے لگا تو اس نے خود کو جدا کیا اور بولی:

''بھلے آدمی لگتے ہو۔''

''ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے محترمہ!''

مارتھا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''ابھی دیکھ لیں گے، اکثر لفافے خالی نکل جاتے ہیں۔'' شریف حسن مسکرا دیئے۔ کچھ دور آگے جا کر مارتھا نے گاڑی پھر روکی اور سامنے •Kiosk سے دو برگر اور ڈھیر ساری فرنچ فرائز •(French fries) اور چاکلیٹ بار لے آئی۔

''گھر چلتے ہیں۔ پینے کے لئے کوک ہے، وائن بھی ہے۔ Dessert کے لئے آئس کریم بھی مہیا ہو جائے گی۔ کیوں، ٹھیک ہے؟''

شریف حسن نے کچھ تشویش سے کہا، ''اتنا کھانا کیا ہوگا؟ مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''تم چلو تو سہی، بھوک بھی لگ جائے گی۔ جلدی کیا ہے۔''

مارتھا کا چھوٹا سا اپارٹمنٹ صاف ستھرا اور قرینے سے سجا ہوا تھا۔

www.taemeernews.com

عورتوں کی مخصوص خوشبوؤں سے معطر۔ داخل ہوتے ہی مارتھا نے اپنا کوٹ اتار پھینکا۔ شریف حسن نے بھی اپنا بھاری کوٹ جدا کیا، پھر جیکٹ بھی اتار دی۔ مارتھا نے سامان خوردنی کچن کاؤنٹر پر رکھا۔ شریف میاں کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر لائی۔ دیر تک اختلاط ظاہری رہا۔ شریف کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ بی مارتھا کیا چمتکار دکھائیں گی۔

''بس اب پہلے ہم کھانا کھائیں گے۔'' مارتھا نے بڑے اعتماد سے کہا، گویا زمام کار اس کے ہاتھ میں ہو۔

مارتھا نے تو کم کھایا لیکن شریف میاں دونوں برگر فرنچ فرائز کے ساتھ کھا گئے۔ دودھ کا ایک کارٹن ریفریجریٹر سے نکال کر سارا دودھ پی گئے، آئس کریم نصف کارٹن اور دو کیلے کھا گئے۔ مارتھا مسکرا کر انھیں دیکھتی رہی، گویا جانور کو تیار ہوتے دیکھ رہی ہو۔

''کھانا کھالیا تو آؤ کافی پیتے ہیں، پھر ریڈ وائن چلے گی؟''

مارتھا نے کافی میں تھوڑی رم ملا دی تھی۔ پھر ایک پورا گلاس سرخ شراب پی گئی۔ بے چارہ غریب ہندوستانی، مرد نا تواں، لڑکھڑانے لگا۔ اسے ڈر لگا کہ اتنی مدہوشی کے عالم میں بالقوۃ کو بالفعل میں کیوں کر بدلوں گا۔ اس نے کچھ دست درازی شروع کی بھی کہ ''رک جاؤ!'' مارتھا ذرا سختی سے بولی۔ ''پہلے ہم نہائیں گے۔''

''ہم، یعنی ہم دونوں ایک ساتھ؟''

''کیوں نہیں، اسی میں تو مزا ہے۔''

یک شب اگر ت مست بیا بم تنہا
دانم چہ کنم اگر نہ دانم چہ کنی
(امیر خسرو)

شریف حسن سکتے میں آگئے۔ ان کے اجداد نے کبھی نہ سوچا ہوگا کہ ایسی صورت حال بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

مارتھا محبوب ہندی کو غسل خانے میں لے گئی۔ خاصا بڑا باتھ روم تھا۔ شریف زادے شیری شرما رہے تھے۔ ''خداوندا!'' شریف میاں کے دل نے فریاد کی۔ میں نے تو اب تک کچھ سیکھا سمجھا ہی نہیں۔ شریف حسن خود کو بہت گھاگ سمجھتے تھے لیکن اب معلوم ہوا کہ محض طفل مکتب ہیں۔ لڑکپن میں پڑھی ہوئی فارسی میں سے طالب آملی کا شعر انھیں یاد آیا

بسوے خویشتن از لطف گستاخانہ کش دستم
کہ من بسیار محجوبم ہم آغوشی نہ می دانم

اس کے بعد کا حال انھیں کچھ ٹھیک سے یاد نہیں۔

سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا تھا کہ شریف حسن نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ اب بھی کچھ ہو رہا ہے۔ نیند بھری آنکھیں کھولیں تو مارتھا کو دوبارہ اپنے قریب دیکھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ گئے۔ طوفان جب تھما تو مارتھا عجب مدہوش لہجے میں بولی:

What a man! Are you a man!

اب انھیں معلوم ہوا کہ وہ مرد نا تواں ہونے کے ساتھ ساتھ مرد مجاہد بھی تھے۔ بزرگوں کی دعائیں رائیگاں نہیں جاتیں۔

مارتھا کے اپارٹمنٹ سے نکلے تو دن کے بارہ بج رہے تھے لیکن رات کا کسل ابھی باقی تھا۔ دل میں کچھ بے چینی بھی تھی، شاید ٹرم پیپر لکھنے کی گھبراہٹ تھی۔ لیکن جب غور کیا تو شریف میاں کو محسوس ہوا کہ بے چینی اس بات کی تھی کہ ابھی سے انھیں شام کا انتظار تھا۔ اور اپنے اوپر غصہ تھا کہ اب تک میں کہاں تھا

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

(۱۰)

تہذیب کا مریض جلد شفا نہیں پاتا۔

ژاں ژنے

''شریف بھائی، تہذیب کا معاملہ ذرا پیچیدہ ہے۔ بہت ساری باتیں اب تک واضح نہیں ہو سکی ہیں۔''

''آپ جیسا عالم تو میں نہیں ہوں حبیب میاں صاحب لیکن تھوڑی بہت واقفیت ضرور ہے۔ جب پوری مشرقی دنیا میں تہذیب پر کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں تو یورپ سے مستعار لی ہوئی چیزیں انتہائی دلکش اور وسیع و ہمہ گیر لگ رہی تھیں۔ گنگا جمنی تہذیب پر بھی فرنگیوں کا گہرا اثر پڑا۔ ڈپٹی نذیر احمد 'ابن الوقت' میں کچھ بھی کہیں، لیکن ہم نے فرنگی سے بہت کچھ سیکھا۔''

''مگر بہت کچھ کھویا بھی۔''

''بالکل درست۔ لیکن بھائی میرے شکست خوردہ تہذیب بڑی مشکل سے معدوم ہوتی ہے۔ وہ ابھرتی ہوئی اور نام نہاد فاتح تہذیب سے بہت کچھ سیکھ لیتی ہے۔ جذب کر لیتی ہے۔ گنگا جمنی تہذیب ۱۸۵۷ کے بعد کالعدم نہیں ہوئی۔ کم از کم مزید سو برس تک زندہ رہی اور نہ صرف خاصے اہم ادارے تعمیر کیے، بلکہ ادارہ ساز، تاریخ ساز ہستیوں کو پیدا بھی کیا۔''

''شریف بھائی کیا یہ وہی تہذیب ہے جس کا خواب مرزا غالب دیکھ رہے تھے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ غالب انیسویں صدی کے عظیم ترین ہندوستانی تھے، سر تا پا اسی سیکولر تہذیب میں ڈوبے ہوئے اور عظیم ہستیوں کی مانند یہ چاہتے ہوئے کہ ہم یورپ کی دنیا سے نئی چیزیں سیکھیں، مصرف میں لائیں، لیکن خود کو برقرار رکھیں۔''

''جی ہاں اور اسی لئے انھوں نے سرسید کی گویا سرزنش کی تھی کہ جاؤ اور انگریزوں سے سیکھو۔''

''بالکل درست۔ اور اسی تنبیہ نے سرسید کو بدل دیا۔ مسلمانوں سے

www.taemeernews.com

چند غلطیاں ضرور ہوئیں۔ انھیں گو کھلے بنا تھا، انھوں نے محمد علی جناح کو جنم دے دیا۔ میں آپ سے کہوں، جناح صاحب گنگا جمنی تہذیب کی پیداوار نہیں ہیں۔"

"نہیں، ایک حد تک تو وہ ضرور ہیں شریف بھائی۔ انھوں نے سرسیّد سے غلط نتیجہ نکالا کہ ہندو انھیں لقمہ تر بنا ڈالیں گے"۔

"دیکھیے جناب من، گنگا جمنی تہذیب نے کبھی بھی ملتوں کے درمیان مذہبی فرق کو اہم نہ مانا۔ یہی سیکولر طریقہ ہے۔"

"لیکن شریف بھائی، دو قوموں کے درمیان اتھاہ خلیج کا تصور تو پہلے جنا ساور کرنے دیا تھا۔"

"دیا ہوگا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں آپ اس گہری خندق میں کود کیوں پڑے؟ ایسے ماحول میں مخلوط تہذیب بہت زیادہ دنوں تک سلامت نہیں رہ سکتی۔ چراغ لے کے ہوا کے سامنے چلا نہیں جا سکتا۔"

"سرسید سے ذرا بھول ہوگئی۔ لندن میں گردن مروڑی مرغی کھا کر وہ سمجھے کہ سرکار انگلیشیہ مغل سلطنت کی مانند پانچ چھ سو سال تک تو قائم ہی رہے گی۔ چنانچہ مسلمانوں کو اس کا وفادار و نمک خوار رہنا چاہیے۔"

"بھائی میرے، ایسا نہیں ہے۔ وہ کانگریس کے اندر پوشیدہ لاوا سے پوری طرح واقف ہوگئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانان ہند تعلیم حاصل کریں، اور پھر میدان کارزار میں اتریں اور اس وقت تک وفادار فرنگیاں رہیں۔"

"لیکن شریف بھائی پھر مخلوط تہذیب کی کشتی تو بحر ذخار کی جانب مڑنے ہی لگی۔"

"سرسید مرزا غالب کی طرح گنگا جمنی تہذیب کو دخانی جہاز کی طرح خطرات سے دور جانتے تھے۔"

تو کیا جناح صاحب نے کشتی میں سوراخ کر دیا؟"

"نہیں بھئی ہم سب ہندوستانیوں نے مل کر، اور حکومت وقت کی مہربانیوں کی بدولت یہ المیہ پیش آیا۔"

"اور ڈوبتی کشتی سے کود کر آپ یہاں مہ جبینوں کے نرغے میں آگئے۔"

"ہاہاہا! کیسی پتے کی بات کی ہے پارٹنر!"

(۱۱)

شیخ منصور جب سے پورب آئے تھے، علیل ہی رہا کرتے تھے۔ ہاضمہ بگڑ گیا تھا۔ سارا جسم کسل مند، کام کی قوت نہ تھی۔ پھر بھی انھوں نے دہلی کے امرا کے مانند ایک بڑی حویلی بنائی۔ آگے خاصی زمین چھوڑ دی گئی تھی، جہاں چمن لگانے کا ارادہ تھا۔ شیخ منصور کو عنابی گلاب پسند تھے۔ جوہی اور چنبیلی بھی پسند تھیں۔ پورب کے امرود انھیں بہت زیادہ مزے دار لگے۔ حویلی کی پشت پر باغ لگایا جانے والا تھا۔ دریا کے رخ جہاں ریت زیادہ تھی خربوزے اور تربوز کی کاشت گرمیوں میں شروع کی جاتی تھی۔ چاروں طرف فصیل کھڑی کرنے کا بھی ارادہ تھا۔

میر فضل الدین تقریباً عالمگیری درباری بن گئے تھے۔ مگر کوئی منصب انھوں نے قبول نہیں کیا۔ دہلی میں ایک حویلی تعمیر کرائی، شادی کی۔ چھ بیٹے اور پانچ دختران تولد ہوئیں۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں شیرخواری میں عالم جاوداں کو سدھاریں۔ میر فضل الدین سال میں ایک دو بار جاگیر پر جایا کرتے تھے۔ وہ والد کی وفات کے بعد خاندان کے سربراہ ہوئے، لیکن انھوں نے سارا کاروبار اپنے چھوٹے بھائی میر صلاح الدین محمد کرم اللہ پر چھوڑ دیا جو صحیح معنوں میں جاگیردار تھے۔ انھوں نے حویلی کو توسیع دی۔ چاروں طرف فصیل کھڑی کرائی اور ان اللہ والوں کا مکان ایک مضبوط قلعے کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ صدر دروازے پر ہاتھی جھولنے لگے اور اصطبلوں میں گھوڑے۔

میر فضل الدین کے علم و فضل کے پیش نظر بادشاہ نے انھیں "فتاویٰ عالم گیری" کی ادارتی مجلس کی رکنیت قبول کرنے کو کہا۔ لیکن میر صاحب نے معافی مانگ لی۔ ان کے بڑے بیٹے میر ابو صالح ہوئے۔ وہ غالباً والد سے بھی زیادہ ہوش مند نکلے، نہ صرف قرآن و حدیث اور متعلقہ علوم پر حاوی بلکہ دنیاوی معاملات میں گہری سوجھ بوجھ رکھنے والے۔ وہ اورنگ زیب بادشاہ کے ساتھ دکن کے مہم میں شریک رہے، "ملا ماژندرانی" کہلاتے تھے۔ سہ ہزاری تھے۔ بادشاہ انھیں "ملائے من" کہا کرتا۔ والد کے کہنے پر وہ بادشاہ سے منتیں کرتے کہ وہ دکن چھوڑ کر دارالخلافہ لوٹ چلے۔ لیکن بادشاہ ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا۔ مشیت ایزدی کے سامنے کوئی کیا کر سکتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے میں عرصہ لگا، لیکن دیمک نے اندر سے چاٹنا شروع کر دیا تھا۔

میر ابو صالح اس راز سے واقف ہوگئے تھے۔ انھوں نے اپنے دوسرے بیٹے میر داؤد سے ایک بار کہا تھا۔" جان پدر، دنیا فانی ہے۔ سلطنتیں وجود میں آتی ہیں، نصف النہار پر پہنچتی ہیں۔ غلطیاں کرتی ہیں۔ خدائے تعالےٰ ظلم و ستم، فرائض سے لاپروائی اور عیش و عشرت کو پسند نہیں فرماتا۔ سلطنتیں غارت ہو جاتی ہیں۔ جتنی شائستگی، جتنی سمجھ بوجھ، حکمت عملی و نظری انھیں عطا کی گئی ہوتی ہے سب کو کیڑا لگنے لگتا ہے۔ شیخ شیراز کو یاد کرو، فرماتے ہیں

دریں فکر بودم کہ کرماں خورم
کہ ناگاہ خوردند کرماں سرم

جب سلطنت کے علم و دانش کو گھن لگ جائے تو ملک گیری اس کے گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔ ہمارا بادشاہ زبردست صاحب تدبیر ہے لیکن نہ جانے کیوں وہ اس راز سے باخبر نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ محی الدین عالم گیر طال اللہ عمرہٗ و خلد اللہ سلطانہٗ اپنی زندگی میں کشتی خلافت کو ڈوبنے سے بچائے رہے تو بچائے رہے، لیکن ان کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کا بیڑا پار ہو جائے گا۔ خدائے کریم ان وقتوں میں تمھیں محفوظ رکھے۔"

لیکن ہاتھی لاکھ لٹے گا تو بھی سوا لاکھ کا ہوگا۔ دلی کی بادشاہت میں ابھی دم خم باقی تھا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے سقوط دہلی کو بھی یہ حکومت جھیل گئی، لیکن محمد شاہ غازی کے بعد (۱۷۴۸) مارژندانی خاندان دہلی سے دور اور اپنی جاگیر پر

www.taemeernews.com

متمکن ہوتا چلا گیا۔ جب شاہان اودھ کا عروج ہوا تو انھوں نے خود کو نئی نظم ونسق سے منسلک کر لیا اور خود بھی نواب منصورہ کہلانے لگے، لیکن ۱۸۵۷ کی شورش تک انھوں نے خود کو مغل جاگیردار ہی تصور کیا۔ ۱۸۵۷ کے بعد دنیا تیزی سے بدلی، شریف حسن کے دادا کے دور تک ماژندرانی سیدزادے سراسر اودھی ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کی تہذیب، نفاست، عیش پرستی اور تعلقہ دارانہ ذہنیت ان کا کی طبیعتوں کا خاصہ بن گئی تھی۔

۱۲

کریو کرم اے دوستاں

شریف حسن اپنی فرم کے کام سے لندن گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے چند دنوں کے لئے بذریعہ ٹرین کارڈف (Cardiff) گئے۔ حبیب میاں استقبال کو موجود تھے۔ شہر سے ذرا باہر ایک پرفضا مقام پر ان کا بنگلہ نما چھوٹا سا مکان تھا۔ تنہا رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ تقریباً برہمچاری زندگی گزارتے تھے۔ ہنگرین گولاش (Goulash) اور اطالوی اسپیگیٹی • (Spaghetti) ان کے پسندیدہ کھانے تھے۔ ان میں قیمے کو فتے ڈالنا ان کی ایجاد تھی۔ کھانا خود پکاتے۔ مختلف طرح کی پنیریں، اور پینے کے لئے سائیڈر کا استعمال کرتے تھے۔ لیکن شریف حسن کے لئے وہ فرانسیسی سرخ وائن خرید لائے تھے۔

شریف صاحب کارڈف شام کے وقت پہنچے تھے۔ آغاز ماہ ستمبر تھا، لیکن ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ دوسرا دن صاف شفاف نکھرا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا میں چمک دار دھوپ بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ دونوں دوست سیر کو نکلے۔ حبیب صاحب انھیں نارتھ ویلز گھمانے لے گئے۔ کیسے دلکش مرغزار تھے۔ ٹھنڈے گھنے جنگلات اور ننھی منی پہاڑیاں۔ عجب پرفضا کہرا سا جنگلوں اور جھیلوں پر چھایا تھا۔ جھیل سے وہ سمندری کنارے پر گئے۔ شریف حسن کو ویلز کی عورتیں معصوم صفت دکھائی دیں۔ دلکش یاقوتی مائل شہابی رنگ، گلنار لب، تمتماتے عارض، لو دیتی جبیں۔

'' ہوشیار رہیں شریف بھائی، ان میں سے چند ایسی ہیں جو آپ کو sold down the river یاد دلا دیں گی!''

'' کیا یہ آپ کا تجربہ ہے چھپے رستم صاحب؟''

'' آزمالیں۔''

'' اہو ہو ہو! میاں صاحب، تم ہو خالص علیگی، خالص جان سے پیارے!''

رات بھیگ چلی تو وہ گھر لوٹے۔ بارش تیز ہو گئی تھیں۔ حبیب میاں صاحب نے ایک دن پہلے فرائیڈ رائس (fried rice)، کچھ چینی، کچھ پارسی، تیار کر لیا تھا جس میں ننھی جھینگا مچھلیاں ڈالی تھیں۔ کئی قسم کی سبزیاں، ذرا سا شلجم، ذرا سا برسلز اسپراؤٹ (Brussels sprout)، بادام، کاجو، کشمش اور تھوڑی شکر۔ مرغ مسلم بھی انھوں نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ کھانا گرم ہوا، مرغ کے پارچے کاٹے گئے۔ شریف بھائی کے لئے وائن موجود تھی، حبیب صاحب کے لئے سیب کا عرق۔

'' شریف بھائی میں نے روٹیاں نہیں پکائیں۔ کونس • (Cones) ہیں کہیں تو سینک دوں۔''

'' ارے بھئی اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ میرے یار میٹھے میں کیا ہے؟''

کھانا لطف لے کر کھایا گیا۔ دونوں خوب بھوکے تھے۔ شریف صاحب نے لہک لہک کر وائن کی تعریفیں کیں۔ '' بھائی بہت عمدہ ہے۔ اتنی شیریں۔ کاش غالب ہمارے درمیان ہوتے۔ قوام کی پتلی، کھانڈ سے میٹھی، کا لطف اٹھاتے، بھائی آپ کمال کی چیز ہیں!''

میٹھے میں ہلکے شکر آلود عرق میں کٹے ہوئے پھل تھے جن پر کریم ڈالی گئی تھی۔ پھر کافی پی گئی۔ شریف بھائی ذرا سرور میں تھے۔ خربوزے کو دیکھ کر دوسرے خربوزے نے رنگ پکڑا۔

' آپ تھکے ہوئے تو نہیں ہیں شریف بھائی؟'

'' نہیں بھائی حبیب میاں صاحب، ساری تھکن لذت کام و دہن کی نذر ہو گئی۔''

دونوں صوفوں پر لیٹ گئے تھے۔

'' بھائی حبیب میاں صاحب، ایسے کھانے کے بعد پورٹ (Port) چلنی چاہیے۔ ایک گھونٹ پی اور جنت میں۔''

'' یعنی غالب کی شراب پرتگالی، کیوں صاحب؟''

'' جی ہاں، بالکل۔ آپ کو تو بہتر معلوم ہے میاں صاحب کہ گنگا جمنی تہذیب کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ اس کی بدولت ایک مخصوص قسم کی مذہبی رواداری، انسان دوستی اور آپس میں مل جل کر رہنے کا شعور پیدا ہوا۔ یہ خصوصیت اس سے پہلے بس ایک حد تک پانچویں صدی قبل مسیح کے ایتھنز (Athens) میں دیکھی گئی۔ پھر بغداد میں ہارون الرشید اور مامون الرشید کے دور میں، اور پیرس میں والٹیئر زمانے میں۔

'' اہم بات یہ ہے کہ یہ خصوصیت نتیجہ تھی اسلامی تعلیمات اور ہندوستانی قلبی طہارت کا۔ میں حضرت نظام الدین اولیا کو اس تہذیب کے اولین بانیوں میں رکھوں گا۔ ان کے بعد سنت کبیر داس اور پھر شہنشاہ اکبر۔ بے شک تینوں کے قلوب نور ایزدی سے معمور تھے۔ ان کی تعلیم کے نتیجے میں ایسی ہستیاں وجود میں آئیں جنھوں نے عالم رنگ و بو کو ترک نہیں کیا، لیکن اس میں اتنا دل بھی نہ لگایا کہ اس کے غلام بن کر رہ جائیں۔ انھوں نے سکھایا کہ صرف بنائے محبت خالی از خلل ہے۔ تغیر پذیر دنیا میں ہم محبت کے نغمے گائیں، حمد خداوندی میں مصروف ہوں، کسی کو کسی قسم کا گزند پہنچانے سے احتراز کریں۔ یہاں سے جائیں تو یوں کہ ہاتھ تو خالی ہو اور قلب منور ہو۔ جیسے جیسے قلب کا نور کم ہونے لگا مخلوط تہذیب اپنے معیار سے اترتی چلی گئی۔''

'' حبیب میاں صاحب، آپ تو عالم ہیں، جارج ایلیٹ نے اپنی ناولوں میں کیا کہا ہے۔''

www.taemeernews.com

''اور میر نے اپنی غزلوں میں۔ ابھی ابھی تک منٹو اپنے افسانوں میں وہی راگ الاپ رہے تھے۔''

''میرے بھائی، صحیح معنوں میں انسان ہونا باحیا اور مہذب ہونا ہے۔ بے حیا اور غیر مہذب کچھ دن کے لئے کامیاب ضرور ہوتا ہے، پھر وہ ہے اور تاریخ کا مزبلہ۔''

''اور پھر ایک یہ بھی بات یاد رکھنے کی ہے، تہذیب اور حیاداری یہ سبق نہیں سکھاتی کہ سب کچھ دنیا پر منحصر ہے۔''

''ہم مخلوط تہذیب کی بات کر رہے ہیں جو کم از کم ۱۹۴۷ تک برقرار رہی۔ پنڈت نہرو، مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور میں کہوں گا خاصی حد تک ڈاکٹر رادھا کرشنن اس تہذیب کے پروردہ تھے۔ جناح صاحب کم تھے، لیکن لیاقت علی خاں از سر تا پا اسی رنگ سے رنگے ہوئے تھے۔ یورپی روشن خیال تحریک نے انھیں مہذب بننے میں خاصی مدد کی تھی۔ میں تو کہوں گا کہ مخلوط تہذیب پر روشن خیال تحریک (Enlightenment) کا گہرا اثر پڑا ہے۔ راجا رام موہن رائے ہوں یا گوپال کرشن گوکھلے، بنکم چندر چٹرجی ہوں یا رابندر ناتھ ٹیگور، آپ کسی بھی قابل ذکر ہستی کے بارے میں سوچیں۔ وہ نہ صرف مخلوط تہذیب کی پیداوار ہے بلکہ روشن خیال تحریک کے بھی۔ سر سید نے ابتدا میں ایک رسالہ لکھا تھا کہ زمین گول نہیں ہے۔ غالب نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ بیسویں صدی کے برصغیر کی سب سے عظیم ہستی گاندھی جی کی ہے۔ انھوں نے مخلوط تہذیب اور ہندو دھرم کی رواداری کی بنیاد پر اپنی شخصیت کی تعمیر کی۔ وہ 'ایشور اللہ تیرو نام' بھی الاپ سکتے ہیں اور Lead, Kindly Light بھی۔ ہندوستان اور پاکستان میں چند سر پھرے لوگ بے مطلب غل مچا رہے ہیں۔ لیکن اگر گنگا جمنی تہذیب میں تھوڑی سی سکت تھوڑی قوت اور بنیادی استقامت باقی رہ گئی ہے تو ایسے غیر ہندوستانی عناصر کا قلع قمع ہو جائے گا۔''

''یعنی شریف بھائی آپ ابھی تک امید کا دامن ہاتھوں سے پکڑے ہوئے ہیں۔ آپ کے منہ میں گھی شکر۔''

''روسی زبان میں ایک کہاوت ہے: امید بالکل آخری وقت میں دم توڑتی ہے۔ ایک بات ہے حبیب میاں صاحب، آپ مجھے بتائیں کہ یہ تہذیب کوئی پانچ چھ سو برس تک اتنی فروزاں، اتنی مستحکم اور اتنی پائدار کیوں کر رہ پائی؟ سارے امکانات موجود تھے کہ ۱۷۳۰ کے بعد مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں، انقلابیوں اور فرنگیوں کی شورش کے بعد اس تہذیب کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ابھی کل تک گوالیار اور کاٹھیاوار کے مہاراج اسی مخصوص تہذیبی رنگ میں نظر آتے تھے۔ آخر وہ کون سی قوت تھی، کون سا شعور و احساس تھا، کون سی فکر تھی جو انھیں اس راہ پر قائم رہنے کی ہمت دے رہی تھی؟''

''اس کا جواب سہل نہیں شریف بھائی۔ تہذیب کے مختلف عناصر و عوامل کو ہم اب تک پورے طور پر سمجھ نہیں پائے ہیں۔ جب عرب فاتح اپنے پرچم لہراتے ایران میں داخل ہوئے تھے تو ایرانی تہذیب دم توڑ رہی تھی۔ پھر بھی ایرانی تہذیب کے گوناگوں اثرات عربوں پر پڑے۔ قدیم ایرانی مذہبی کتابیں تقریباً مفقود ہو گئیں کیوں کہ اسلام ایک زبردست، متنوع پسند اور سکون و طمانیت بخشنے والا مذہب ثابت ہوا۔

جب مخلوط تہذیب نے شمالی ہند میں ابتدائی قدم بڑھائے تو جارحانہ، ترکیت ہندوستانی ماحول کے اثر سے نرم ہو چلی تھی۔ مقامی قدیم مذاہب و رسوم نے بھکتی تحریک سے متاثر ہو کر نہ صرف وحدت خداوندی کا نغمہ الاپنا شروع کیا، بلکہ یہ تصور بھی عام ہونے لگا تھا کہ بھگوان کے سارے بھگت ایک ہیں اور اگر وہ ذاتوں اور فرقوں میں تقسیم ہیں بھی تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ رواداری اور انسان دوستی پھر بھی ہمارا لائحہ عمل بن سکتی ہے۔ فرنگیوں نے اس ڈھانچے میں تبدیلیاں ضرور لانے کی کوشش کی، لیکن بنیاد اس قدر پختہ اور ساتھ ساتھ لچک دار بھی تھی کہ فرنگی نے عمارت کمزور تو کر دی لیکن اسے مسمار نہ کر سکا۔''

شریف حسن ذرا جھومتے ہوئے بغور سن رہے تھے۔

''ہاں بھائی میرے آپ درست فرما رہے ہیں لیکن چند در کھل نہیں پائے ہیں۔ ان پر بھاری قفل پڑے ہیں۔ کیا وہ غلامی کی لعنت تھی جس نے کلاسیکی یونانی تہذیب کا خون کر دیا؟ کیا ترک غلاموں کی بدولت بغداد کی ماہ درخشاں جیسی جگمگاتی تہذیب کو گہن لگ گیا؟ سینکڑوں برس کی مدت میں برصغیر میں ایسا زبردست انقلاب نہیں آیا جو اس تہذیب کا شیرازہ بکھیر دیتا۔ فرنگیوں کے لائے ہوئے اقدار و اثرات کو اس تہذیب نے رفتہ رفتہ خود میں سمو لیا۔ اور پھر یہ مغربیت بھی آہنگی کے ساتھ یہاں اثر انداز ہوئی۔

''آپ غور کریں تو دیکھیں گے کہ یورپی تہذیب کے عناصر جو یہاں آئے ان پر بہت کچھ اسلامی تہذیب کا بھی اثر تھا۔ اور جہاں تک سیکولرازم کا سوال ہے، ہماری تہذیب باقاعدہ طور پر سیکولر تو تھی ہی۔ جاگیردارانہ نظام میں رفتہ رفتہ زوال آتا گیا لیکن ایسا لگتا ہے کہ اورنگ زیب کے بعد، خصوصاً عوامی تحریکوں کی بدولت اس نظام میں انتشار پھیل رہا تھا۔ امن و امان کے ماحول میں تبدیلیاں ضرور آنے لگی تھیں۔ مختلف علاقے مرکزی ماحول سے دور ہو گئے۔ مختلف قومیں اور ذاتیں اعلان خود مختاری کرنے لگیں۔ بنیاد ضرور ثابت و سالم رہا۔ انگریز نے اس ماحول کا مطالعہ کیا اور بہتر جانا کہ زیادہ تبدیلیاں نہ لائی جائیں۔ سامراجیت بہر حال سرمایہ دارانہ نظام کی ماں ہے۔ برصغیر خام مال پیدا کر سکتا تھا، تیار شدہ مال یہاں فروخت کیا جا سکتا تھا۔ راجا، نواب، تعلقہ دار، زمیندار مراعات کی لالچ میں حکومت کی پشت پناہی کر سکتے تھے۔ جب آزادی آئی (اور اسے آنا لازمی تھا) تو تہذیبی روایات اچکن کے بٹن، ہندو کالج اور مسلم کالج کے طلسم میں گرفتار ہو گئیں۔ اسی طرح جس طرح بازنطینی قسطنطنیہ میں عیسائی پادریوں کو یہ فکر لگی رہتی تھی کہ کتنے فرشتے ایک سوئی کی نوک پر بیٹھ سکتے ہیں۔ ہائے رے قدرت کے کھیل، میں اپنی ٹوپی ہوا میں اچھال کر "حبذا" کہنا چاہتا ہوں!''

''شریف بھائی، ہمارا اللہ ارسطوئی اللہ نہیں ہے۔ وہ کارساز ہے، ان داتا ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے۔''

www.taemeernews.com

''لیکن ہم انسانوں سے ذرا اخفا رہتا ہے، کیوں؟''
[شریف بھائی پر فرنچ وائن چڑھ رہی ہے کیا؟ حبیب میاں نے خود سے پوچھا۔]

''اب آپ دیکھو بھیا مورے، مجھ میں یہاں آن کر جب تہذیبی شعور جاگا تو اب میں ہمہ وقت اپنی تہذیب کے اجڑنے پر آنسو بہاتا رہتا ہوں۔ اللہ سے مناجات کرتا رہتا ہوں کہ اس تہذیب کو دوبارہ جوان کردے۔ حبیب میاں کیا ایسا ممکن ہے؟''

''افسوس ہے شریف بھائی، یہ تقریباً ناممکن ہے۔ مارکس کا قول یاد کیجئے کہ تاریخ اگر خود کو دہراتی ہے تو اپنا بھونڈا چربہ ہوتی ہے۔''

''ارے بھائی میاں صاحب! مناجات میں گھاٹے کا تو خدشہ نہیں۔ اور اللہ تاریخ ساز ہے، اسے سب مانتے ہیں۔ آپ قدرت کا کھیل کہیں یا اتفاق کا کرشمہ، یا ان ہونی کا ہونی ہو جانا، لیکن ممکن سب کچھ ہے۔''

''شریف بھائی، کافی کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟''

''پلا دے پارٹنر پلا دے۔ تھوڑی رم بھی ڈال دے تو کیا بات ہے۔''

''رم تو موجود نہیں۔ میں جا کر لے آتا لیکن موسلا دھار ہو رہی ہے۔''

دونوں دوست دیر تک خوش گپیوں میں مشغول رہے۔ حسیناؤں کا ذکر نہ چھڑا، ورنہ قیامت آجاتی۔

۱۳

مرے دلبروں کی عجب آن ہے

شریف حسن کے دادا نواب مولوی سید فخر الحسنین ماژندرانی ۱۸۷۷ میں پیدا ہوئے، ۱۹۳۲ میں مچھلی کا کانٹا نرخرے میں پھنس جانے کی وجہ کر جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ انتہائی وجیہ، نکلتا ہوا قد، رنگ صندلی، آنکھیں اگر ایک بار کسی قتالۂ عالم پر مرکوز کردیں تو وہ پیشواز سنبھالتی ہوئی قدموں پر آن گرے۔ کاٹھی مضبوط، جسم بھرا بھرا، ذرا سی توند، ناک ستواں ہوتے ہوتے ذرا موٹی ہو گئی تھی، پیشانی صاف۔ کہتے تھے، ہم ماژندرانی ستھری جبیں لے کر آئے ہیں۔ ایک بت طناز نے ان کی پیشانی کو بار بار بوسے دئے تھے۔ سردیوں میں گول سیاہ کامدار ٹوپی پہنتے۔ سردیوں میں مفلر ضرور گلے کا ہار ہوا کرتا۔ گرمیوں میں اونچی دیوار کی سفید چکن کی دو پلی ٹوپی اوڑھتے۔

وہ جب سفید براق انگرکھا، چوڑی مہری کا پاجامہ، دو پلی ٹوپی اور پیٹنٹ لیدر کا پمپ شو پہن کر دیوان خانے کے لئے برآمد ہوتے تو عورتیں اور باندیاں کہتیں: ''دیکھو تو ہمارے نواب جی کو۔ یوں دمک رہے ہیں جیسے اللہ میاں کا فرشتہ۔''

ان کی والدہ مرحومہ نے نظر بد سے بچنے کے لئے سارے ٹوٹکے کر ڈالے تھے۔ نواب فخر الحسنین کو اپنے حسن پر ناز تھا۔ لکھنؤ کی طوائفیں مرتی تھیں۔ وہ کسی پر نہ مرے، ہاں ایک کے بعد دوسری کو داشتہ بنا کر ضرور رکھا۔ اولاد کسی سے نہ ہونے دی کہ دوسرے خون کی ملاوٹ پسند نہ تھی۔ تمام عمر حسن کے دیوانے رہے۔

جب ساٹھ ہونے کے قریب آئے تو ساٹھا پاٹھا کے برخلاف انتہائی انہماک کے ساتھ نمازیں پڑھنی شروع کردیں۔ باقاعدگی سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے، دعاؤں میں گنگناتے

تری ذات ہے انوری سروری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

گنگا کی ریہو مچھلی کھانے کا انھیں ازحد شوق تھا۔ ایک دن کانٹا گلے میں جا کر یوں پھنسا کہ سانس رک گئی۔ جس نے سنا متحیر رہ گیا کہ صحت بہت اچھی تھی۔ سر کے محض چند بال سفید ہوئے تھے۔ ہاں مونچھیں نیش عقرب کی مانند اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں، سفید ہو چلی تھیں۔ داڑھی کچھ ایسی رکھ لی تھی جیسی کہ سگمنڈ فرائڈ کی تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بھی تھی۔ اجلے کپڑوں میں ملبوس، ٹوپی جب اتار دیتے تو ذرا ارنسٹ ریناں (Ernest Renan) جیسے لگتے۔ حافظہ اچھا تھا، ہزاروں شعر یاد تھے۔ خود بھی گاہے شعر کہتے، شوکت تخلص تھا۔

ان کا لکھنؤ کا سفر لکھنؤ بڑے ٹھسے سے ہوتا تھا۔ سندیلے سے ریل میں بیٹھتے، ہمیشہ سکنڈ کلاس میں سفر کرتے۔ پانچ ملازم ساتھ ہوتے۔ چار باغ اسٹیشن پر فٹن کھڑی رہتی۔ فٹن حویلی سے آتی تھی جہاں ان کی داشتہ نہا دھو کر جوڑے سجا کر ہمہ تن انتظار رہتیں۔ پہلی داشتہ اس لئے ہٹائی گئی تھی کہ نواب صاحب کے چہرے پر پھوڑے پھنسیاں ابھرنے لگی تھیں۔ حکیموں نے کہا، آتشک کا خطرہ ہے۔ علاج ہوا۔ خون صاف ہوا۔ دوسری مال زادی خدمت کے لئے لائی گئی۔ انگریزی ڈاکٹروں نے پہلے معائنہ کیا، صاف ستھری نکلی۔ جب سے مصلے پر بیٹھنے لگے، اس دلچسپ و پرلطف شوق سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ لکھنؤ میں حویلی اسی طرح رہی۔ ان کے کارندے اور خادمان کبھی اپنی دلبستگی کے لئے معمولی رنڈیوں کو بہلا پھسلا کر حویلی میں لے آیا کرتے تھے۔

نواب صاحب انگریزی حکومت کے سچے وفادار تھے۔ خان بہادر کا خطاب پایا تھا۔ وائسرائے ہند نے ان کا نام لندن کے دربار میں خطاب سری کے لئے بھیجا تھا۔ اگر کچھ دنوں اور حیات رہتے تو ''سرفخر الحسنین'' کہلاتے۔ لکھنؤ آتے تو لاٹ صاحب بہادر کے دربار میں باریابی کی درخواست کرتے۔ لکھنؤ میں ان کے کئی خان بہادر اور رائے بہادر احباب تھے جن کے ساتھ بیٹھ کر انگریزی شراب پی جاتی۔ چوسر، شطرنج کھیلی جاتی، مجرا سنا جاتا، لیکن دوستوں کے اصرار کے باوجود کسی کو پہلو میں لے کر استراحت نہ فرماتے۔

شریف حسن نے اپنے دادا کو نہیں دیکھا۔ بڑی بوڑھیوں سے قصے سنے تھے۔ دادا جان کے ایک خاص ملازم تھے، ''بخشو چچا'' کہلاتے تھے۔ بخشو چچا بھی ان کے مزے دار قصے نمک مرچ لگا کر بچوں کو سنایا کرتے:

''بٹوا، دادا جان تمہارے ایسے تھے کہ اگر کسی عورت کو سر اٹھا کر دیکھ لیتے تو وہ ان کی گود میں آکر بیٹھ جاتی تھی۔''

''بخشو چچا، کے عورتیں دادا جان کی گود میں آکر بیٹھی تھیں؟'' بارہ سالہ شریف میاں نے پوچھا تھا۔ چچا ہنسے تھے۔ ''میاں، گنتی مجھے یاد نہیں... درجنوں ضرور

www.taemeernews.com

رہی ہوں گی۔"

شریف میاں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بھی عورتوں کو گود میں بٹھائیں گے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

نواب صاحب کے نو اولادیں ہوئیں۔ پانچ نہ بچیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑ گئے۔ بیٹوں کی شادیاں خاندان سے باہر اعلیٰ خاندانوں میں ہوئیں۔ بڑے صاحبزادے مولوی سید افتخار الحسن، یعنی شریف میاں کے والد ماجد، والد بزرگوار سے قطعی مختلف نکلے۔ جب جوانی پختگی پر آنے لگی اور احباب و عزیزان و خدمتگاران و خیر خواہان امید کر رہے تھے کہ اب وہ لکھنؤ جا کر مختلف پھولوں کی بو قلمونی کا لطف اٹھائیں گے اور بوسے کسے سے لطف اندوز ہوں گے تو انھوں نے مذہبی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ حویلی میں پرانی کتابوں کا اتھاہ خزانہ الماریوں میں محفوظ رکھا تھا۔ یوں بھی بڑے نواب کو کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ مطبع نول کشور کی جملہ کتابیں موجود تھیں، مختلف مقامات جیسے دہلی، کان پور، بدایوں، عظیم آباد، آرہ، میرٹھ وغیرہ کی کتابیں بھی جمع کر رکھی تھیں۔ پھر پرانی قلمی کتابیں اور مخطوطات تھے۔ ایک بڑے سے مقفل بکس میں شیعہ سنی تنازع پر کتابیں تھیں۔ افتخار الحسن میاں صاحب گویا دوبارہ تحصیل علم کرنے لگے۔ شاعری سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، لیکن گھریلو ماحول کی بنا پر شعر فہم تو تھے ہی۔ اچھے اور برے اشعار میں تمیز کر سکتے تھے۔ "طلسم ہوش ربا"، "فسانۂ آزاد"، "سیر کہسار"، "داستان امیر حمزہ" کی جلدیں بھی پڑھ ڈالی تھیں۔

ان کے تبدیل ذہن و خیالات کی داستان ذرا دلچسپ ہے۔ جب وہ چودہ پندرہ سال کے تھے، اتفاقاً ایک مہری کی تقریباً اسی عمر کی بیٹی کو سخت گرمی کی ایک دوپہری میں کپڑے تبدیل کرتے دیکھ لیا۔ لڑکی بھی غالباً اپنے حسن کا مظاہرہ کرنا چاہتی تھی، دیکھ سمجھ کر بھی انجان بن گئی۔ افتخار میاں عاشق ہو گئے۔ ان کی صورت شکل بھی جوانی کے دیوانی ہونے کا انتظام کر رہی تھی۔ رنگت شہابی تھی، چہرہ پھول کی مانند نازک، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، مسیں پھوٹ رہی تھیں۔ لونڈیا نے شاید کچھ اور خواب بھی دیکھ لئے تھے۔ میاں کا اشارہ پا کر مناسب موقعے سے تنہائی اور یکجائی کا انتظام اس نے خود ہی کر لیا۔

وہاں کیا ہوا، یہ اب تک ایک راز ہے۔ لیکن جب میاں صاحب کوٹھری سے نکلے تو چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ سیدھے والدہ کے پاس گئے۔ کیا کہا، کیا سنا اوپر والا بہتر جانتا ہے۔ لیکن اسی دن سے کایا پلٹ ہو گئی۔ سب کے سب فکر مند ہوئے کہ جوان لڑکا، نواب کا بڑا بیٹا یوں کتابوں سے چٹ جائے جیسے کہ دیمک۔ "بی بی، آسیب کی کارستانی ہے"، بڑی بوڑھیوں نے کہا۔ "موسم گرما کی شدت سے ذہن مختل ہو گیا ہے"، یہ حکیموں کی رائے تھی۔ مختلف قسم کے شربت، جوارشیں، جو تجویز کئے گئے۔ والدہ ہلکی مسکراہٹ اور آنکھوں میں طمانیت لئے سب دیکھتی اور سنتی رہیں۔

جب جان عزیز نے تہجد گذاری شروع کی تو والد بزرگوار نے اپنے کمرے میں بلایا۔ بید کی ایک لمبی کوچ پر تقریباً نیم دراز تھے۔ گاؤ تکیہ کمر میں تھا۔ پیچوان کی مہنال ہاتھ میں، سارے کمرے میں دور سے خمیرے کی گھنی خوشبو پھیل رہی تھی۔ صاحبزادے حاضر ہوئے، سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ ہوا:

"آپ کے احوال کیا ہیں میاں صاحب؟ آپ نے تہجد کی نمازیں پڑھنی شروع کر دیں اور میں نے اب تک فجر بھی ابتدا نہیں کی ہے۔ حضت، یہ آپ کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ پتنگیں اڑائیں، شطرنج کھیلیں۔ کبھی کبھی لکھنؤ نکل جائیں، بالاخانوں میں آداب مجلسی سیکھیں...

"میاں جی، ریاست سنبھالنی ہے، حکام سے ملنا ہوگا، بڑے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہوگا۔ اب سب لوگ انگریزی لباس پہننے لگے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں، آپ بھی یہ طریقے سیکھنے کی کوشش کریں۔ تھوڑے دنوں کے لئے علی گڑھ چلے جائیں۔ گھڑ سواری کریں، کرکٹ کھیلیں۔ آپ میری بات سن رہے ہیں یا ہونق کی مانند بس منہ پھاڑے اپنے خیالات میں گم ہیں؟"

افتخار میاں ہلکے سے بولے:

"ابا حضور میں علاقے کے انتظامات میں آپ کے حکم کے مطابق حصہ لوں گا۔ لیکن عبادت میرے اور اللہ رب العلمین کے درمیان کا معاملہ ہے۔ میں آپ کے سارے حکم بجالانے کو تیار ہوں لیکن احکام نبوی سے سر مو تجاوز نہیں کر سکتا۔"

تھوڑے دن بعد افتخار الحسن کی شادی کر دی گئی۔ بیگم کے ساتھ ایسا حسن سلوک تھا کہ بڑی بوڑھیاں عش عش کرتی تھیں۔ "بھنو، افتخار میاں تو فرشتہ ہیں فرشتہ۔" سسرال والیوں میں سے ایک نے کہا۔ میرٹھ سے آئی ہوئی ایک بوا بولیں: "ایک ہی لگائی پر مرمٹا ہے لونڈا۔ دنیا اسے نہیں دیکھنی کیا؟"

شریف حسن باپ کے دوسرے بیٹے تھے۔ بڑے بھائی کئی سال بڑے تھے۔ یہ وہ دن تھے کہ سارا ملک کانگریس کی تحریک آزادی سے مخمور ہو رہا تھا۔ گاندھی جی سرزمین ہند کے بے تاج بادشاہ بن گئے تھے۔ لیکن تحریک خلافت کی ناکامی نے مسلمانوں کو گاندھی جی سے بدظن بھی کر دیا تھا۔ کانگریس کی باتوں سے دل برداشتہ ہو کر محمد علی جناح لندن بیٹھ رہے تھے۔ بڑے اصرار سے واپس بلائے گئے۔ اب مسلمانوں کی بڑی تعداد مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئی۔ قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔ ادھر بھائی جان علی گڑھ جا چکے تھے۔ وہاں سے بی۔اے۔ کیا، قانون پڑھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ تقسیم ہند کا اعلان ہوا۔ ہر طرف فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ یوپی کے تقریباً سارے مسلمان تعلقہ دار اور بڑے زمیندار اور سرکاری ملازم مسلم لیگ کی مالا جپ رہے تھے، سب کے سب اپنی املاک اونے پونے فروخت کر کے پاکستان جا کر مہاجر بن رہے تھے۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کا طبقۂ اشراف ایک عجیب انقلاب سے دوچار تھا۔ پاکستان بنا تو ہندوستانی مسلمانوں کے عملی مسائل بھی سامنے آئے جنھیں اب تک جذبات کی شورش نے دور پھینک رکھا تھا۔

مولوی افتخار الحسن نے سارے معاملے پر غور کیا۔ میں منصورہ کو کراچی نہیں لے جا سکتا۔ اور میرا وہاں ہے ہی کون؟ اس زمین کو میرے آباواجداد نے

www.taemeernews.com

اپنے خون سے سنوارا ہے۔ ہمارے باغ ہیں، کھیت ہیں، یہ حویلی ہے، گومتی ندی ہے۔ پاس میں گنگا بہتی ہے۔ ہم نے اپنے برادران کے ساتھ مل کر ایک تہذیب کو فروغ دیا ہے۔ میرے مولا، میں کیا کروں۔ میرے پاک پروردگار یہ ساری زمین تیری ہے۔ مجھے راستہ دکھا!''

بھائی جان نے اچانک اعلان کیا، ''میں کراچی جا رہا ہوں۔''

''کراچی میں تمھارا کون ہے؟'' افتخار میاں نے پوچھا۔

''کئی عزیز و اقارب ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان ہیں۔ ہم پاکستان کی تشکیل و تعمیر میں حصہ لیں گے۔''

''اور منصورہ کا کیا ہوگا؟''

''ابا جان، یہ سب فروخت کر دیں۔ ہم اب ہندوستانی نہیں رہے۔ اب ہم پاکستانی ہیں۔ یہاں سے ہمیں کیا لینا؟''

افتخار میاں سن سے ہو کر رہ گئے۔ شریف حسن بیٹھے سنتے رہے تھے۔ انھوں نے کچھ کہنا چاہا خاموش رہے وہ پاکستان نہیں علی گڑھ جانا چاہتے تھے۔

(۱۴)

''بھائی حبیب میاں صاحب ہم ٹھنڈے ٹھار ایران سے گرم مرطوب ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ ایران میں مذہب اثنا عشری ہم نے قبول نہ کیا تھا، آپ جانتے ہی ہیں۔ ہندوستان آ کر ہمارے خاندان والے یوں سمجھ لیجیے فرنگی محلی جیسے رہے۔ جناب امیر اور حسنین کو علیہ السلام تو ہم نے کہا اور اب بھی کہتے ہیں لیکن انھیں، یا اور کسی بھی امام کو معصوم نہ جانا۔ جب ''وہابیت'' کا شور اٹھا اور انگریزوں نے باقاعدہ ان کے خلاف پروپگنڈا شروع کیا، تو بھی ہمارے دادا پردادا مغفور بزرگان دیوبند کی تعظیم کرتے تھے۔ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ میں نہیں سمجھ پاتا ہوں کہ اہل دیوبند، مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے رفقا، سرسید احمد خاں کے اس قدر خلاف کیوں ہو گئے۔ سرسید کا ایمان تو درست تھا، اور نیت صاف۔ تفسیر احمدیہ میں سرسید مرحوم بار بار کہہ رہے ہیں کہ عقل و شعور کے ذریعہ معاملات کو جانو، ہمارا مذہب بھی عین مطابق عقل ہے۔ تو اس میں بری بات کیا تھی؟

معتزلہ بھی کچھ ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ مولوی حقانی نے اپنی تفسیر میں اور خصوصاً اس کے مقدمے میں کیا کیا باتیں سرسید کے خلاف کہی ہیں۔ مولوی صاحب عیسائیوں سے مناظرے تو کرتے ہیں جو کہ اس وقت مذہبی فیشن تھا، لیکن وہ سرسید کو سمجھ نہ پائے۔ مصر کے مفتی محمد عبدہ اور علامہ رشید رضا بھی کچھ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ میں تو بھائی اپنے والد مرحوم کی باتوں سے طا تفاق کرتا ہوں۔ جناب، ازمنہ وسطیٰ کی منطق موجودہ دور میں ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تیغ و سناں کا بھی زمانہ لد گیا۔ رستم و سہراب قسم کی دو بدو جنگیں اب صرف قصے کہانیوں میں پڑھی جا سکتی ہیں۔''

''شریف بھائی، سرسید آپ کے اور ہمارے امام ہیں، لیکن کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے سائنس، یا یوں کہیں علوم عقلیہ پر بہت زیادہ بھروسا کیا۔

وہ سمجھے تھے کہ ان علوم کے ذریعہ مسلمانوں کے سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔''

''بھروسا تو انھیں کرنا ہی تھا میرے بھائی۔ خدشہ یہ تھا کہ مسلمان جدید دنیا سے منہ موڑ کر کنویں کا مینڈک نہ رہ جائیں۔ ۱۹۴۰ کے بعد چند اسلامی مفکروں کے ذہن میں یہ غلط بات ابھری کہ معذرت خواہان مغرب اصل اسلام کو ختم کر ڈالیں گے۔ ضرورت تو یہ تھی کہ اسلامی لوگ پوری طرح علوم جدیدہ لیس ہو کر اپنی فکری بنیاد کے سہارے مغرب پر حاوی ہو جائیں۔''

''لیکن پوری طرح ماڈرن بن کر مسلمان کیا مسلمان رہ جائے گا؟ وہ چوں چوں کا مربہ نہ بن جائے گا؟ شاید وہ اس دنیا کا بن سکے گا اور نہ اس دنیا کا۔''

''اسلام جدید دنیا میں اسلامی تہذیب کے ذریعہ ہی باقی رہ سکے گا۔ بلکہ ترقی کرے گا۔ یہ نہیں کہ ہم ارکان خمسہ کو بھول جائیں یا ترک کر دیں۔ یورپی روشن خیالی اور اسلامی وحدت ربانی، وحدت انسانی، اور ایک قسم کی صوفیانہ عالمگیری کی رواداری اور رقیق القلبی واحد علاج ہے، نجات کا واحد طریقہ کار ہے۔''

(۱۵)

یہی وادی ہے وہ ہمدم

شریف حسن نے سیتاپور مشن اسکول سے ہائی اسکول پندرہ سال کی عمر میں پاس کیا۔ مسیں بھیگ چلیں تھیں۔ اس عمر میں عام بچے آٹھویں نویں میں ہوتے ہیں۔ وہ دسویں میں اس لئے تھے کہ تیسرے درجے میں انھیں ڈبل پروموشن ملا تھا۔ مشن اسکول کا بوڑھا ولندیزی پادری فان ہوف شریف میاں کو بہت مانتا تھا۔ گھر پر وہ مولوی کریم بخش سے فارسی اور عربی پڑھتے تھے اور اسکول میں پادری صاحب اسے انگریزی اور حساب پڑھاتے تھے۔ ہند اسلامی تہذیب کی بنیادیں انھوں نے گھر پر ہی دیکھ لی تھیں۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور کی اردو اور فارسی کتابیں، مولانا تھانوی کی ''بہشتی زیور'' جسے دادی جان طاق پر رکھا کرتی تھیں، ''ہنس جواہر'' نامی قصہ، اردو رسم الخط میں ''پدماوت'' اور گوسائیں تلسی داس کی ''رامائن''، طوطا رام شایاں کا منظوم ترجمہ ''مہابھارت''، ''بیتال پچیسی''، ''سیت بسنت''، اور پھر والد صاحب کی ادق کتابیں، مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریریں، شاہ ولی اللہ صاحب کی ''فیوض الحرمین''، ان سب سے وہ شناسا تھے، کوئی ضروری نہیں کہ پڑھ ہی ڈالا ہو۔ ان کے والد صاحب حضرت شاہ ولی اللہ اور شیخ العرب والعجم حضرت امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے بڑے معتقد تھے۔

۱۹۴۷ کی شورشوں میں مسلم یونیورسٹی تقریباً اجڑ کر رہ گئی تھی۔ پنجاب سے طلبا، جنھیں رشید احمد صدیقی یونیورسٹی کا گارجین گردانتے تھے، آنے بند ہو گئے تھے۔ بہار و بنگال کے فسادات نے وہاں کے اشراف کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی مساعی کی بدولت یونیورسٹی دھیرے دھیرے خود کو سنبھالنے لگی تھی۔ محض چند ہی پرانے پروفیسران رہ گئے تھے۔ ابا حلیم (پروفیسر اے۔ بی۔ اے۔ حلیم) بھی سرزمین پاک کو چلے گئے تھے۔ جمیل کو ااڑان بھر چکے تھے۔ لیکن ہاسٹلوں کی آبادی رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ مٹریاں زیادہ تیار ہونے لگی تھیں۔ مولانا قبرستانی بھی کباب اور پوریاں خونچے میں رکھ کر میاں لوگاں کی کھینچائی سننے کو دوبارہ

www.taemeernews.com

بیتاب ہو چلے تھے۔

''پارٹنر، مولانا قبرستانی کی آواز آرہی ہے۔''

''کس مردود کی لاش چرائی ہے؟''

''کانڈھلے والے پارٹنر کی لاش چرائی ہوگی۔''

''آہستہ بول یار۔ ڈاکٹر عاشق علی کہیں سن نہ لیں۔''

''بھیا اس وقت بیگم سے لپٹ کر بھائیں بھائیں رو رہے ہوں گے۔''

''کیا کسی اور سوختہ دل کو حلال کر ڈالا؟''

''یار مولانا قبرستانی کباب اچھے بناتے ہیں۔۔ ہم بھی ذرا نوش فرمائیں۔''

طے یہ پایا تھا کہ معصوم بچہ اپنے ایک عزیز کے ہمراہ علی گڑھ جائے گا۔ یہ صاحب دور کے عم زاد تھے۔ محمد حسین نام تھا، منصورہ میں جھنو میاں کے نام سے پکارے جاتے تھے، علی گڑھ میں جنید بھائی۔ مدتوں سے ایس۔ ایس۔ ہال میں بود و باش اختیار کر رکھی تھی۔ کینے ڈی پھوس میں منوں برفیاں اور کوئی پانچ ہزار چائے کی پیالیاں پی کر بی۔ اے۔ میں بفضل ایزدی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ جس نے سنا ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا:

''اچھا۔ تو جھنو میاں آخر کار گریجویٹ ہوگئے!''

''ہاں بھئی اب پاس آکر لیٹ سکتے ہیں۔''

ان کا ارادہ مزید قسمت آزمانے کا تھا۔

''جھنو میاں سنا ہے آپ ماسٹرس کرنے جا رہے ہیں؟'' شریف میاں کے ایک ذرا خبطی چچا نے دریافت کیا تھا۔

جنید بھائی کی طبیعت ہوئی کہ علیگی لٹھ بازی کے جوہر دکھائیں۔ لیکن وضعداری کا پاس تھا۔ بس سر ہلا کر رہ گئے۔

''کس مضمون میں ایم۔ اے کرنے کا ارادہ ہے میرے بھائی؟''

''جی چچا جان سوچ رہا تھا انگلش میں کر ڈالوں۔ لیکن اب ارادہ ہے اکنامکس لے لوں۔''

''میاں صاحب زادے اکنامکس تو ذرا ادق مضمون ہے۔ اردو وردو میں کر ڈالو۔ چرکین کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔''

اب جنید بھائی سے ذرا برداشت نہ ہو سکا۔ لیکن زیادہ بدتمیزی نہیں کی۔ بولے:

''چرکیں کا دیوان دلوا دیں، حفظ کر لوں گا۔''

یہ طے پایا کہ صاحبزادہ بلند اقبال جھنو میاں کے ساتھ اس ٹرین سے ٹونڈلہ تک جائیں گے جو کہ علی الصباح لکھنؤ سے چل کر آگرے کو جاتی ہے۔ دو دن سے شریف میاں کو زکام بخار سا ہو رہا تھا۔ لیکن آج طبیعت بہتر تھی۔ انٹر کلاس میں سفر کرنا طے پایا۔ جنید بھائی تھرڈ میں جانا چاہتے تھے کہ جو پیسے بچیں، چائے اور سگریٹ کی نذر ہوں۔ بہر حال کوئی چھ بجے ایکسپریس ٹرین سیتاپور اسٹیشن پر آئی۔ ڈبے میں سوار ہو کر جنید نے ایک اوپری برتھ پر چادر بچھادی۔ دیگر مسافران نے ذرا تعجب سے دیکھا۔ معذرت خواہانہ لہجے میں پرانا علیگی چابک دست بولا: ''بچے کی طبیعت ناساز ہے علاج کے لئے دہلی لے جا رہا ہوں۔۔'' پھر بولے، ''جائیں میاں، آپ اوپر لیٹ جائیں۔'' شریف پر ہلکی غنودگی اور جذباتی اتھل پتھل کا تلاطم تھا۔ اوپر جا کر لیٹ گئے اور تھوڑی ہی دیر میں انٹا غفیل ہوگئے۔ گاڑی تیز چل رہی تھی۔ برسات کا موسم تھا، ہوا میں شراب کی تاثیر تھی۔

جنید میاں اطمینان سے بیٹھ گئے۔ جیب سے برکلے سگریٹ کا پیکیٹ نکالا۔ شوق فرمانے لگے۔ کئی اور یوں ہی مشغول تھے۔

ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ جنید میاں کو کینے ڈی پھوس کی یاد آئی۔ کود کر ٹرین سے اتر کر چائے کے اسٹال تک گئے۔ شریف میاں کی آنکھ کھل گئی تھی آواز سنائی دی: ''سلام علیک جنید بھائی!''

''سلام علیک۔ ابے کون ہے؟ اچھا پارٹنر! تو کہاں جا رہا ہے ابے سارس؟''

شریف میاں نے دیکھا کہ جنید بھائی ایک لمبوترے سے شخص کے ساتھ ہاتھوں میں چائے کا کوزہ پکڑے داخل ہو رہے ہیں۔ نووارد کا رنگ سانولے کی حد سے گذر کر شامل سیاہی تھا۔ یہ تو کالا سارس ہے، شریف حسن نے خود سے کہا۔

''اسلام علیکم پارٹنر''، نووارد ذرا رعونت کے لہجے سے بولا۔

''وعلیکم السلام''، شریف میاں ہلکے سے بولے۔

''ذرا صاف گلے کا استعمال کریں میاں صاحبزادے''، جنید بھائی بولے۔ ''یہ ہیں اسرار احمد خاں۔ صرّاف کی اولاد ہیں۔'' گاڑی چل پڑی۔ چائے جب ختم ہوئی تو جنید بھائی بولے۔ ''سگریٹ ابے او بے ڈھنگے سارس!''

''جنید بھائی میں نے توبہ کر لی ہے۔''

''ولد الحرام جھوٹ بولتا ہے۔''

اسرار بھائی نے (Number Ten) نمبر ٹین کا پیکٹ نکالا۔ دونوں دوست خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے۔ ''جانتے ہیں جنید بھائی، مردود صغیر پیچھے کی راہ سے نکلا ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟ ویسے تو وہ ہے ہی خنزیر کی اولاد۔''

''حاجی صاحب نے فزکس کا پیپر بنایا تھا۔ انوار پیپر آؤٹ کر کے مجھے دے گیا۔ میں نے پرزے بنالئے۔ لیکن جب اسٹریچی ہال میں پیپر ملا تو بالکل مختلف تھا۔ دیکھ کر مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔ سب لوگ دوڑے، پانی پلایا گیا۔ میں نے کاپی واپس کی، آکر سو گیا۔ کوئی چار بجے انوار حرامزادے کو ڈھونڈنے لگا۔ پٹھا پھوس میں چائے پی رہا تھا، بولا۔ ''یار پیپر بدل گیا۔ میں بھی فیل ہو جاؤں گا۔ اس نے مجھے نمک پارے اور برفیاں کھلائیں۔'' دونوں دوست باتیں کرتے رہے شریف میاں نے مغلظات سنے۔ پھر انھیں نیند آگئی۔

۱۷ جولائی ۱۹۴۹ کی شام چھ بجے کے بعد کا اکا میل علی گڑھ اسٹیشن پر آکر رکی۔ جنید بھائی شریف حسن کو لے کر اترے۔ اسرار احمد خاں غائب ہوگئے

www.taemeernews.com

تھے۔ ایک قلی آیا اور جنید بھائی کو پہچان کر بولا ''سلام میاں''۔ سامان اٹھایا گیا۔

''بھائی حبیب میاں صاحب، مجھے اسٹیشن بہت معمولی اور ویران سا لگا۔ چند لڑکے شیروانیاں پہنے شغول کر رہے تھے۔ کئی ایک نے جنید بھائی کو سلام کیا۔ انھوں نے یوں مزاج دریافت کیا جیسے کوئی داروغہ پٹے ہوئے ملزم سے دریافت کرے۔ آگے بڑھے تو ایک معمر سے حضرت دکھائی دیئے۔ ڈھیلی، لانبی اچکن، تنگ مہری کا پائجامہ، پمپ شو، سر پر سرخ ترکی ٹوپی۔

''جنید میاں نے سلام عرض کیا۔ معمر شخص کے ہاتھ میں سونٹا تھا۔ اسے ہلاتے ہوئے ٹھٹکے، پالتو جانور کو ایک نظر دیکھا:

'''آگئے جناب، کیا حال چال ہیں؟'

'''آپ کی دعائیں ہیں مختار صاحب'، پھر شریف حسن سے بولے، 'سلام کرو!' انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔

'''سلام علیکم، کہو میاں داخلہ لینے آئے ہیں آپ؟'

'''جی مختار صاحب'' جنید میاں بولے۔ 'شریف الحسن نام ہے۔ میرے کزن ہیں۔ پڑھنے میں بہت تیز ہے جناب۔'

'''میاں دل لگا کر پڑھو۔ سرسید کی درس گاہ ہے۔ پڑھ لکھ لیں گے تو قوم کا نام روشن کریں گے۔'

''مجھے پتہ چلا حبیب میاں صاحب کہ یہ ہیں مختار گھوڑا۔ سائکل پر یوں بیٹھتے جیسے سائکل نہ ہو گھوڑا ہو اور کبھی بھی ان کو پٹک دے گا۔ یونیورسٹی کے سارے پرانے لڑکوں کے نام سے واقف تھے۔ برسہا برس سے اسسٹنٹ پراکٹر تھے۔ آپ جانتے ہی ہیں، پورا کام سنبھالے ہوئے تھے۔''

تانگے پر سامان لادا گیا۔ دھان پان میاں شریف خستہ جاں پیچھے سامان کے ساتھ لادے گئے۔ جنید بھائی آگے یوں بیٹھے جیسے راج سنگھاسن پر براجمان ہوں۔ ادھر ادھر نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے، نوگرفتار طائر حیران و پریشان کو جغرافیہ کا سبق دیتے گئے۔ یہ ہے کورٹ، یہ اولڈ بوائز لاج ہے۔ یہ کرکٹ کا میدان ہے۔ پلیا پر مڑے تو بتایا کہ آگے شمشاد مارکیٹ ہے۔ یہ رہا میکڈانل، یہ ہے آفتاب ہاسٹل، یہ ہے مردودوں کا ممتاز۔ تانگہ باب الحق سے کچی پارک میں داخل ہوا۔ شام کی ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ چند طالب علم اچکنوں میں ملبوس گردن کٹی مرغیوں کی مانند پھڑ پھڑا کر جسد خاکی سے جدا ہونے کے موڈ میں تھے۔ تانگہ گھوم کر عثمانیہ آیا۔ ایک ذرا سنٹڈے خادم نما شخص نے جنید بھائی کو دیکھتے ہی کہا ''سلام میاں!'' میاں صاحب کا سینہ پھول کر غٹر غوں کرتے کبوتر کی مانند ہو گیا:

'سلام پیر محمد۔ کیسے ہیں بھئی آپ؟''

''آپ لوگوں کی دعاؤں کی بدولت باحیات ہوں۔''

سامان اتارا گیا۔ جنید بھائی نے پوچھا۔ ''عنایت آفتاب صاحب کے کمرے میں کوئی آیا ہے؟''

''جی اب تک کوئی میاں تشریف نہیں لائے ہیں''۔

''سامان وہیں رکھ دو۔ ایک چارپائی کا انتظام کر دینا۔ مچھر دانی بھی لگے گی، اور ہاں میاں صاحب کے کھانے کا انتظام آپ کر دیں۔''

''کھانا؟ اچھا میاں، انتظام ہو جائے گا۔ آپ نہائیں گے میاں صاحب؟ بخشو سقہ پانی بھر گیا ہے۔''

شریف میاں کو ایک مصرع یاد آیا: 'لنگی کی جھپ دکھا کے سقنی نے مار ڈالا'۔ پوچھنا چاہتے تھے، سقنی نہیں آئی کیا؟ لیکن خاموش رہے۔

کمرہ نمبر ۱۱۲ خاصا ہال سا تھا۔ خالی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ایک کونے میں پرانی لکڑی کی میز تھی اور دو خستہ و کوفتہ کرسیاں۔ دوسرے کونے میں ایک چارپائی، بلکہ کھاٹ سی پڑی تھی۔ گھر پر مستقیمن بوا تھی، تین چار بتھنیوں کا وزن ضرور ہوگا۔ دادی اماں تخت پر گاؤ تکیہ کے سہارے پڑی رہا کرتیں۔ زبان پر یا اللہ یا رحمن، یا رحیم کا ورد رہتا۔ بوا پائینتی بیٹھی ایک رومال سے تلووں کو سہلاتی رہا کرتیں اور کہتی جاتیں۔ ''بی اماں، لکھنؤ والے حکیم کے یہاں سے تیل منگوا لو۔ لونڈی مالش کر دے گی۔'' اگر مستقیمن بوا یہاں کھٹیا پر ذرا زور سے بیٹھ جاتیں تو کھٹیا کھڑی ہو جاتی۔ چارپائی دیکھ کر میاں شریف کو ایک مصرع مزید یاد آیا: 'اٹھ جاگ جولا ہے بھور بھئی تو کیوں کھٹیا پر سووت ہے'۔

بڑے کمرے کے پیچھے ایک مختصر سا کمرہ تھا جہاں نواڑ کا ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ پیچھے ایک در تھا، لکن سلاخوں سے بند۔ چھوٹا سا باتھ روم تھا۔ نل میں پانی نہیں آ رہا تھا لیکن ٹنکی میں پانی بھرا تھا۔ شریف میاں غسل کرنے گئے۔ پانی تقریباً یخ بستہ تھا۔ دل میں سرسام کا خوف ابھرا۔ چند ڈونگے بدن پر ڈال کر بالوں کو بھگو کر نکل آئے۔ والدہ نے ہدایت کی تھی کہ وضو ضرور کرنا اور نمازیں پڑھتے رہنا۔ کانپتے ہوئے باہر نکلے، کرتا پائجامہ زیب تن کیا۔ اتنے میں پیر محمد آئے۔ ''کھانا لگادوں میاں؟''

شریف میاں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ذرا سی دیر میں کھانا آ گیا۔ سرسید کا نسخہ تھا۔ تام چینی کی ایک پلیٹ میں سالن جس پر دبیز زرد پرت جمی ہوئی تھی۔ ایک مختصر سی پلیٹ میں ماش کی دال، دوسری میں ٹنڈے کی سبزی۔ دو نانیں۔ صاحبزادے کو ابکائی سی آئی۔ پیر محمد نے ان کی جانب دیکھا، ذرا مسکرایا، بولا: ''گرم کر لے آتا ہوں میاں۔''

تھوڑی دیر بعد گرم ڈنر آیا۔ ''میاں دو تین دن میں اچھا لگنے لگے گا۔'' پیر محمد مسکرا کر بولے۔

غذا خلاف توقع اچھی لگی۔ تینوں نانیں شریف نے کھالیں۔ پیر محمد نے پوچھا تھا: ''میاں برفیاں لاؤں؟''

چینی کی ایک پلیٹ میں برفیوں کی تین قاشیں تھیں۔ بڑی مزے دار لگیں۔ شریف نے کھا کر ڈھیر کا سا پانی پیا۔ پھر برآمدے میں آئے۔ پیر محمد نے اندر والی کھولی پر بستر بچھا کر مچھر دانی لگا دی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ طویل برآمدے میں تین چار بستر یوں ہی لگے تھے۔ دریافت کیا۔ ''جنید بھائی کا بستر نہیں لگایا آپ نے؟''

''میاں کمرے کے اندر سوتے ہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ سلام

www.taemeernews.com

میاں صاحب!''

انھیں غنودگی آنے لگی۔ لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد شور سا اٹھا۔ انھوں سر اٹھا کر دیکھا۔ چنڈالڑ کے ٹھٹھول کر رہے تھے۔ ایک بولا:

''تازہ شکار ہے۔''

''حلال ہو جائے گا۔ ابھی چین کی بنسری بجانے دو۔''

شریف حسن کی علی گڑھ میں پہلی شب کا آغاز ہو چکا تھا۔

''میں آپ کو کیا بتاؤں حبیب میاں صاحب۔ میں ہفتے عشرے میں وہاں کے بحر ذخار میں شارک مچھلی کی مانند تیرنے لگا تھا۔ لٹن لائبریری ذہن کو بالیدگی عطا کر رہی تھی۔ شراب علم سے سارا ماحول نشہ آور لگ رہا تھا۔ میں نے ایک سال مستقل اچکن اور تنگ مہری کا پائجامہ پہنا مگر ٹوپی نہیں لگائی۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتا۔ جامع مسجد جا کر جمعہ کی نمازیں پڑھتا۔ والدہ نے ڈپٹی نذیر احمد والے ترجمہ قرآن کا نسخہ دیا تھا، کبھی کبھی اسے الٹ کر دیکھ لیتا۔ انگریزی اور اردو کی کتابیں پڑھنے کا سلسلہ جو شروع ہوا تو ختم ہونے میں نہ آیا۔ سکنڈ ایر میں مذہب اور اچکن سب تیاگ دیا۔ بش شرٹ اور پتلون پہننے لگا۔ گمان ہونے لگا کہ خدا کا تصور ذہنی بلوغ کی پیداوار نہیں ہے۔ لیکن آپ یاد رکھیں میرے بھائی میں کبھی بھی مکمل طور پر دہریہ نہیں ہوا۔ بہت مطالعہ کیا پھر بھی خلش باقی رہی۔ اب بقول امام غزالی دمشق کی بوڑھیوں کے مذہب پر مرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے علم ہے شریف بھائی۔ آپ...آپ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں۔''

''ہاہاہا، برگزیدہ کی خوب کہی۔''

(۱۶) فارغ مجھے نہ جان

۲۷ اپریل ۲۰۰۲: حبیب کو شریف حسن کا نیویارک سے بھیجا ہوا ایک لفافہ ملا۔ شریف بھائی نے اطلاع دی تھی کہ ۱۱ اپریل کو وہ ۶۸ سال کے ہو گئے۔ اور انھوں نے ایک تامل برہمن خاتون شکنتلا سے عقد کر لیا ہے۔ خاتون ان سے پندرہ سال چھوٹی تھیں۔ پہلے شوہر وفات پا چکے تھے۔ کوئی اولاد نہ تھی۔ ناول نگار تھیں۔ حبیب میاں صاحب نے دوسری صبح نیویارک فون لگایا۔ ایک خاتون نے فون اٹھایا:

''ہیلو!'' کیا خالص ہندوستانی لہجہ تھا۔

''بھابی مبارک ہو!''

''تھینک یو۔'' خواندہ تاملوں کا انگریزی لہجہ اکثر اسکاٹ افراد جیسا ہوتا ہے۔

''میں حبیب ہوں۔''

''گڈ ایوننگ! میں ابھی شریف کو بلاتا...تی ہوں۔'' لہجہ مدراسی تھا۔

شریف بھائی اسے مشرّف بہ اسلام کر رہے تھے۔ عورت کچھ بھی ہو جائے جب توڑ کا وقت آتا ہے، مرد سے زیر ہو جاتی ہے (مصرع، طاقت ہے بدن میں تو خفا ہونے نہ دے گی۔)

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر شریف بھائی کی وہی بجی سجائی آواز آئی:

''بھائی حبیب میاں صاحب، سلام علیک!''

''سلام علیک شریف بھائی! شادی مبارک ہو!''

''شکریہ، مہربانم، جانم، مشفقم!... ہاں بھئی آخر کار تن سے سر جدا ہوا۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں شریف بھائی؟ کیا آپ خوش نہیں ہیں؟''

''نہیں بھئی۔ میں بہت خوش ہوں۔ شکنتلا موتیوں میں تلنے کے قابل ہیں، لیکن...''

''تو پھر یہ لیکن کیا؟''

''ارے میاں صاحب بڑھاپے کی شادی ہے۔ باسی کڑھی میں ابال! بھائی حبیب میاں صاحب وہ چیز جسے کہتے ہیں خلوت صحیحہ، ہم دونوں کے درمیان پاک بازی صحیحہ ہوتی جا رہی ہے۔ ہم دونوں بستر میں لیٹ کر دیر تک پڑھا کرتے ہیں۔ نیند آنے لگتی ہے تو ایک دوسرے کو مقدس مورتی کے مانند چوم کر نیند کی دیوی کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ میں میاں صاحب، جنس زدہ انسان، اور اب لگتا ہے سیف برہنہ سیف زنگ خوردہ بنتی جا رہی ہے۔''

''حد ہو گئی شریف بھائی، کیا شادی محض ہم بستری کا دوسرا نام ہے؟ خیر چھوڑیں ان باتوں کو۔ ایک خوش خبری سناتا ہوں، میں نیویارک آرہا ہوں۔''

''کیا کہا، نیویارک آرہے ہو، واہ واہ! سبحان اللہ۔''

''جی جناب۔ میں ۲۵ مئی کو نیویارک پہنچ رہا ہوں۔ ۲۶ مئی سے تین دن کے لئے کولمبیا میں ایک مذاکرہ ہے۔''

''بہت خوشی ہوئی حبیب میاں صاحب۔ جناب آپ سیدھے میرے گھر آئیں گے۔''

''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے شریف بھائی۔ کانفرنس والوں نے ہوٹل میں انتظام کر دیا ہے۔''

''ہوٹل پر دو انھیں ایک توپ نہاوندی۔ نہ تو آپ کو جناب لونڈیوں سے رغبت اور نہ شراب طہور سے الفت۔ ہوٹل میں بیٹھ کر ناف کو گھوریں گے یا زیر ناف کو؟''

''شریف بھائی کسی کو پکڑ لاؤں گا کچھ ناپ تول کی بات تو ممکن ہو گی۔''

''ہاہا! ہو ہو!'' نہ معلوم کیوں قہقہے میں وہ پرانا کرارا پن نہ تھا۔

دونوں دوست کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے۔ شکنتلا سے بھی پھر دو منٹ باتیں ہوئیں۔

''بھابی ذرا خیال رکھیں۔ انتہائی نایاب چیز ہیں آپ کے شوہر صاحب...''

مس جانتی ہوں بھائی صاحب میرا شوہر ایسا ویسا ہرگز نہیں۔"

"نہیں صاحب، اور بڑا مرد آدمی ہے۔"

اس پر کوئی ہنسی نہیں ہوئی۔

حبیب میاں کا جہاز کوئی گیارہ بجے دن کو نیویارک پہنچا۔ خاصی ٹھنڈ تھی۔ کسٹم سے فراغت پا کر وہ سامان کی ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے باہر نکلے۔ باہر آتے ہی آتے انھوں نے دیکھا کہ شریف بھائی، ذرا کھوئے سے، ذرا متجسس، ذرا اکتائے ہوئے سے کھڑے ہیں۔ برابر انگوری سلک ساری اور سرخ بلاؤز میں ایک محترمہ تھیں۔ رنگ جیسے چھنے ہوئے آٹے میں شہد ملا دیا گیا ہو۔ بال ترشے اور رنگے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں ایک بھاری سوئٹر اور دوسرے میں ایک پرس لئے ہوئے تھیں۔ چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ۔ حبیب میاں صاحب نے ہاتھ ہلایا۔ شریف حسن پہچان گئے۔ ہاتھ ہلا کر آگے بڑھے۔

"خوش آمدید۔ خوش آمدید۔" شریف صاحب نے گرم جوشی سے کہا۔

"سلام علیکم بھائی جان۔ بھابی صاحبہ بندہ سلام عرض کرتا ہے۔ لیکن آپ لوگوں نے ناحق زحمت فرمائی۔ میں خود سے آجاتا، راستہ میرا دیکھا ہوا ہے۔"

"لو اور سنو" شریف صاحب بوڑھی عورتوں کے انداز میں بولے۔ "میاں صاحب آپ کے علاوہ، وہ جو کہتے ہیں، میرا جگری، اور کون ہے؟ اللہ نے مجھے ایک دوست دیا ہے۔ اور میں ناقدری کروں؟"

حبیب میاں نے دیکھا کہ شریف بھائی کچھ نحیف سے ہوگئے ہیں۔ قدموں کے اٹھانے میں پہلے والا بانکوں جیسا انداز نہیں تھا۔ بار بار دائیں بائیں نظریں دوڑا رہے تھے۔ آنکھوں پر سنہری عینک تھی۔ پہلے صرف پڑھتے وقت لگایا کرتے تھے۔ انھوں نے سرمئی سوٹ پہن رکھا تھا اور خلاف معمول اودے رنگ کا ایک سوئیٹر بھی زیب تن تھا۔ کنپٹی کے بال سفید ہوگئے تھے، اور سر پر کچھ کم۔ شگفتہ بھابی کی کاٹھی مضبوط تھی۔ کان میں ننھے آویزے، گلے میں موتیوں کا ہار، بائیں کلائی میں گھڑی، دائیں میں محض ایک سونے کی چوڑی تھی۔ غالباً اپنی تامل روایت سے گلو خلاصی چاہتی تھیں اور شریف بھائی کی اس تہذیبی کائنات میں قدم رکھ چکی تھیں جہاں کا طوران کے خمیر شدہ چاول کے پکوان سے مختلف تھا۔ تامل تہذیب کا رشتہ گنگا جمنی تہذیب سے ذرا اجنبی سا رہا ہے، اگرچہ تامل برہمیت تو شمالی ہند ہی سے آئی تھی۔

گھر پہنچ کر حبیب نے ایک طرز کی تبدیلی محسوس کی، ایسی تبدیلی جو کوئی عورت ہی کسی گھر میں لا سکتی ہے۔ صوفے نہ صرف نئے تھے بلکہ ان کی جگہ بھی بدل دی گئی تھی۔ ایک بڑا سا ٹی وی سیٹ وہاں براجمان تھا جہاں پہلے ایک پرانا سا ریڈیو گرام تھا۔ کھڑکیوں کے پردے بدل گئے تھے۔ ہلکی سی اچار چٹنیوں کی مہک بھی انھوں نے محسوس کی۔

دونوں دوست ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ شگفتہ کافی بنانے چلی گئیں۔ حبیب نے کھانا جہاز پر کھا لیا تھا۔ شریف صاحب نے ٹانگیں اٹھا کر میز پر رکھیں، دوست کی جانب دیکھا۔ ذرا مسکرائے، بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولے:

"حبیب میاں صاحب کوئی دس دن ہوئے میرے سینے میں سخت درد اٹھا۔ طبیعت بالکل منتشر ہوگئی۔ والدہ مرحومہ بار بار یاد آ رہی تھیں۔ کئی دن ہوئے خواب میں بھی میں نے ان کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی۔ غور کیا تو دیکھا کہ میرا سین تھی۔ اس دن وجع صدر ہوا تو میرا سر بھی چکرانے لگا کہ معاملہ دل کا ہے کہ دماغ کا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔ ڈھیر سا خون نکالا گیا، ٹسٹ ہوئے، بالآخر انجیو گرافی ہوئی۔ پتہ چلا کہ قلب کا معاملہ ہے۔ Cardio-vasular disease ہے، اور بات دور تک جا سکتی ہے۔

پھر جناب دونسوں میں انجیو پلاسٹی ہوئی، کئی دن Intensive care میں رکھا گیا۔ اب ساری احتیاطوں کا حکم ہے۔ ریڈ میٹ بند، تلی ہوئی چیزیں بند، روزانہ ایک گلاس سے زیادہ سرخ شراب نہیں پی سکتے۔ وہسکی صرف ایک پیگ اور وہ بھی کبھی کبھی۔ باقی سب، رم موقوف، واڈکا موقوف، شیری اور پورٹ ذرا سی محض ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی ہی کبھار ممکن ہے۔ صبح شام کی چہل قدمی لازم۔ ابلا ہوا چکن، ابلی سبزیاں، صبح ناشتے میں دو سوکھے ٹوسٹ، اگر ذرا جلے ہوئے ہوں تو بہتر ہوں گے۔ مکھن بالائی زہر، بس ذرا سی مارجرین۔ جو چیز مجھے میٹھے کے طور پر ملتی ہے، آپ اسے منہ میں رکھ کر تھوک دیں گے۔ بس سائیڈر پر گزارہ ہے۔ دہی کھا سکتا ہوں۔ نمک سراسر موقوف۔ اب ہم Potassium Chloride چکھتے ہیں، اور وہ بھی بہت کم۔ اب آپ بتائیں میاں صاحب کوئی زندہ رہے تو کیوں کر؟ ڈھونڈ ڈھانڈ کر غالب کا دیوان نکالا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا کرتا ہوں اور ایک کتاب اور جس پر آپ تعجب کریں گے، یعنی "حصن حصین"، اور اس کا ترجمہ۔" وہ ہنسے، لیکن کچھ بے دلی سے۔

"ایسی کوئی بات نہیں شریف بھائی، آپ دوائیں استعمال میں رکھیں، صحت واپس آجائے گی۔"

"بھائی حبیب میاں صاحب میں دس بارہ مزید سال زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ دنیا بہت کچھ بدلنے والی ہے۔ بدلی ہوئی دنیا دیکھ کر رخصت ہونا چاہتا ہوں۔ ہمارے بزرگوں نے اچھی عمر پائی۔ مجھے بھی تھوڑی مل جاتی۔" پھر وہ ایک لحہ ٹھٹک کر ذرا آہستہ سے بولے، "گو میں از سر تا پا گناہوں سے لدا ہوا ہوں۔"

حبیب سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے۔ موسم بہار کا ہلکا ترشح رک رک کر ہو رہا تھا۔ سامنے کی کھڑکی کے باہر ایک کارڈینل چڑیا آ کر بیٹھی۔ شیشے پر ایک دو چونچیں ماریں اور اڑ گئی۔

"میں ابھی آیا میاں صاحب۔ آپ Jet lag تو نہیں محسوس کر رہے ہیں؟" شریف صاحب ذرا سنبھل کر اٹھتے ہوئے بولے۔

"نہیں، بالکل نہیں۔" حبیب نے میز پر سے ایک رسالہ اٹھایا، وہ "رولنگ اسٹون" Rolling Stone کا تازہ شمارہ تھا۔ الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہے تھے کہ شگفتہ کمرے سے باہر آئیں۔ انھوں نے گلابی رنگ کی ریشمی قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ سفید دوپٹے سے جسم کو یوں احتیاط سے لپیٹا تھا جیسے سردارنیاں گردوارے جاتے وقت کرتی ہیں۔ وہ ذرا ہچکچا رہی تھیں۔ حبیب صاحب نے صوفے

www.taemeernews.com

سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ اسے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اب وحبیب نے غور سے دیکھا تو شکنتلا خاصی حسین لگیں۔ اس عمر میں خوب صورت عورت کے اندر ایک مخصوص قسم کی دلکشی آجاتی ہے۔

"آپ جانتے ہیں مسٹر حبیب،" وہ رک رک کر بول رہی تھیں۔ اکثر اردو میں انگریزی بولنے لگیں۔ "شریف نے آپ کی اتنی تعریف کی ہے کہ... مجھے معلوم نہ تھا کہ ایسے اچھے لوگ دنیا میں پائے جاتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کہتی ہیں آپ بھابی۔ وہ جو آپ کے برابر سوتا ہے آپ یقین جانیں، غیر معمولی انسان ہے، ہر معنوں میں غیر معمولی۔"

"Oh, I know... I know very well جانتی ہوں بھائی صاحب، His mind is like a computer وہ نہ صرف ہر چیز کے بارے میں جاننا چاہتا ہے بلکہ جانتا بھی ہے۔ جب میں پہلی بات ملی تھی، I was captivated by his personal charm, but میں نہیں سمجھتی تھی کہ اس کا دماغ بھی اتنا اچھا ہوگا، ہاں۔"

"بھابی، گنگا جمنی تہذیب انسان کے اندر کے جوہر کو نمایاں کر دیتی ہے۔ آپ مجھے اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتائیں۔ جس خاتون نے شریف بھائی کو گرفتار کیا وہ کوئی معمولی خاتون تو نہیں ہو سکتی۔" حبیب مسکرا کر بولے۔

وہ ذرا سا شرمائیں، نگاہیں جھکا کر بولیں: "ہمارا ہسبینڈ جہاز air crash میں مر گیا۔ What can I tell you? I am from Madras. I felt lost, didn't know what to do.• میرا brother فلوریڈا میں رہتا ہے، مجھے وہاں لے آیا۔ لیکن وہاں ہم خوش نہیں تھا۔ میرا ایک cousin مجھے Brooklyn لے آیا۔ His wifw was my friend from school days. پھر ایک دن میرا کزن بولا، 'تم فکشن لکھتا، چلو ایک پارٹی میں۔' we went to a place where there a lot f people talking میں دیکھا کہ ایک ہندوستانی میرے کو بار بار دیکھ رہا تھا اور ہلکے سے مسکرا رہا تھا۔ He was sitting in the front row. پھر ہم ایک ہال میں گیا جہاں کھانے پینے کا سامان تھا پھر وہ ایک گلاس لئے میری طرف آیا۔ اور ہلکے سے بولا "ہیلو"۔

My cousin had vanished. This Indian guy was very handsome, like Dilip Kumar or Raj Kapoor of old days. I took a coke, took a seat and answered in the same vein. میں نے کہا، "ہیلو جی۔" وہ بولا، "آپ اردو جانتی ہیں؟" میں نے بولا، "ہاں۔" وہ بولا۔ "آپ کچھ لے نہیں رہی ہیں؟" Then he went and ایک بھرا گلاس شیری کا لایا۔ میں نے بولا: "No, No! میں ڈرنک نہیں کرتی۔" وہ مسکرایا: خاموش رہا، پھر بولا: "نشہ تو آپ اپنی آنکھوں سے پلاتی ہیں۔ شراب کی کیا ضرورت ہے۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ بس کیا بتاؤں مسٹر حبیب I fell for him right there. He was so charming, wearing a black suit with a bow tie. Such a commanding presence. We met many times again. He took me out for dinner. We went to see plays on Broadway. He took me to New York Library, and pointed out the books, many of them at Washington State University. His eyes were not those of a wolf. He was so very charming, so very considerate. We went to eat at a French place. He was unusually silent. We were having coffee. He was looking into his cup. میں آپ سے بولتی بائی صاحب شریف نے مجھے کبھی بھی بیچ نہیں کیا۔

ہم بائی صاحب تھوڑا ایموشنل تھا۔ آپ سمجھتا ہے نا؟ آپ عورت کو نہیں سمجھتا۔ جس سے عورت لو کرتا۔ اس سے چاہتا کہ وہ آگے بڑھے۔

Suddenly Sharif extended his hands towards me. Took them. And said slowly, "شکنتلا تم مجھ سے شادی کروگی؟" میں نے اس کی طرف آنکھیں اٹھائیں، دیکھا کہ His eyes were tear filled. His face a kind of rosy. He again said very very slowly. شکنتلا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مجھ سے شادی کرلو۔ He was trembling a bit. I raised my head, looked into his eyes and somehow burst out `Yes! Yes! Yes!' He silently looked at me and went on srying. ` What's it Sharif? Why are you crying? I hope you are not sorry alrady!' میں نے jokingly کہا۔ He answered;

' کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ والدہ مرحومہ یاد آگئیں۔' پھر بولا، ' My late mother ... I dont know what she would have saidbut I know for sure she would have been happy.'

A few days later he took me to Bronx zoo. It was snowed over. We sat on a cold wooden bench, all wrapped up in heavy coats, caps and scarf. We were looking at a birds' sanctuary. He suddenly leaned across and kissed me verylightly on my lips.

I would میں آپ سے کیا کہوں ایسا لگا آسمان پر لگا کر اڑ رہا ہے have kissed him black and blue. Would have then and there made love to him. But it seemed he was not in this world. He took me to his place for the very first time. Gave me a cup of light tea with doughnuts. We sat on the sofa. He leaned towards me, as he has always leaned towards a friend. Very serious, his face scarlet شکنتلا، میری خواہش ہے تم میرا مذہب قبول کرلو، اگر تمھیں اعتراض نہ ہو، میری بس اتنی سی بات

www.taemeernews.com

مان لو۔'' I answered; Yes Yes, why not? I have read about Islam. I always liked to emphasie the unity of God, the oneness of all religions, and equality between hearts. Then he asked me in English; 'Who is your deity, Shakuntala?' I answered; Shiva. Then he smiled and said in a most pleasing manner ''تو پھر شیو سے پراتھنا کرو کہ ہم دونوں شیو اور پاربتی بن کر رہیں!'' سچ مانئے میں ہنس دی۔ شیو اور پاربتی، واہ صاحب واہ۔ He took me to a mosque in Queens, where a mullah gave me a piece of paper on which bismillah was written. He asked me to recite it seven times. Then in simple and idiomatic English he told me about Islam. We were first married in a Civil Court, and then in the same mosque in the Islamic manner. My cousin wanted a marriage according to Tamil traditions as well. I told him that as I am now a muslim, it will not be correct to go back to my former religion."

شکنتلا خاموش ہوگئی تھیں۔ حبیب صاحب بغور انھیں سنتے اور حیرت کرتے رہے تھے۔ کبھی وہ ان کے چہرے پر نگاہیں دوڑاتے، کبھی سر جھکا کر گویا اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کو دیکھنے لگتے۔ جواب کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ دفعتاً شریف صاحب اپنے کمرے سے باہر آئے۔ انھوں نے سفید کرتا اور پائجامہ پہن رکھا تھا، اس کے اوپر سلیٹی رنگ کا گاؤن۔ انھوں نے دونوں کی جانب دیکھا، مسکرائے اور بولے:

''اچھا تو آپ لوگ محو گفتگو ہیں۔ جاری رہیں، میں بھی تو سنوں کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔''

''نہیں میں اٹھ ہی رہی تھی''، شکنتلا بولیں: ''مجھے کچن میں کچھ کام ہے۔''

''بھئی، میں تھوڑی دیر میں حبیب میاں صاحب کے لئے چائے بناؤں گا۔ آپ بھی نوش فرمائیں گی جانم؟''

شکنتلا نے کوئی جواب نہ دیا، ہلکے سے مسکرائیں، اور ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر اٹھ گئیں۔ شریف حسن انھیں لگاوٹ سے دیکھتے رہے۔

''شریف بھائی، آپ نے بھابی سے کیا کہا تھا کہ آپ خدا کو ناراض نہیں کرنا چاہتے؟''

''بھائی میرے ہمارے ہاں ایک ماما تھیں، بوالطیفن کہلاتی تھیں۔ اگر کوئی بچہ شرارت کرتا تو کہتیں، ''بیٹا ایسا نہ کرو، اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے۔'' ''میں نے جب بھی کوئی برا کام کیا ہے، یعنی عورتوں کے معاملے میں... تو مجھے ہمیشہ بوالطیفن یاد آئی ہیں۔ مجھے ہمیشہ ڈر لگا رہا کہ اللہ میاں مجھ سے ناراض ہو کر مجھے ناکارہ نہ بنا دیں، اور میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان نہ دے دوں۔ یہاں ایک اسپتال ہے۔ میموریل سلون کیٹرنگ (Memorial Sloane Kettering) یہاں پرانے بوڑھے دولت مند جو کینسر کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں، لائے جاتے ہیں اور سڑتی سبزی کے طور پر رکھے جاتے ہیں۔ دوزخ جیسی سزا انھیں یہاں ہی مل رہی ہوتی ہے۔ ریگن جو یہاں کا صدر تھا پچھلے دس برس سے وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو چکا ہے۔ اپنے کئے کی سزا پا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر عذاب طاری نہیں کرنا چاہتا لیکن گناہ گار اسے مجبور کر دیتے ہیں۔ دادی جان اللہ کو صرف رحیم و رحمن جانتی تھیں۔ میں اپنی دادی کا گناہ گار پوتا ہوں۔ اللہ ان کی بات سنتا تھا۔ انھوں نے مجھے ڈھیری دعائیں دی ہیں۔ ان ہی کا سہارا ہے۔ حبیب میاں صاحب ان ہی کا سہارا ہے۔ خدا نے مجھے ذہن عطا کیا۔ مجھے طاق سے جفت ہونے کی استطاعت بخشی۔ مجھے صبر کی تلقین ضرور کی لیکن میں عورتوں کے پیچھے ہمیشہ دیوانہ رہا۔''

''شریف بھائی، آپ نے یہ کپڑے کب سے پہننے شروع کئے؟''

''یہ؟'' انھوں نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا: ''یہی کوئی پانچ چھ ماہ سے۔ مجھے بہت آرام دہ لگتے ہیں۔ اب میں انھیں ہی پہن کر سویا کرتا ہوں۔ شکنتلا بھی گھر پر شلوار قمیص پہننے لگی ہیں۔'' وہ ذرا رک کر سوچتے ہوئے سے لہجے میں بولے۔ ''کیا بھائی میرے، ہم دوبارہ اسلام کی جانب لوٹ رہے ہیں؟''

''شریف بھائی، آپ کبھی بھی اسلام سے منحرف نہیں ہوئے۔''

''وہ مارا! آپ درست کہتے ہیں۔''

''خدائے کریم و رحیم سے پوچھ لیں وہ جواب آپ کے قلب پر ظاہر کر دے گا۔''

''بھائی میاں صاحب، میں نے کبھی بھی خدا کو ایک ہستی کے طور پر تسلیم نہیں کیا، جیسے کہ ایک کتاب، ایک پیڑ، ایک انسان، ایک ستارہ۔ نہیں، وہ ماورائے وجود ہے۔ وہ ہمارے دل کے اندر بھی ہے اور نہیں بھی۔ وہ ایک قوت ہے جو ساری کائنات میں جاری ہے، اور ہم میں بھی جاری ہے۔ آپ کے اور ہمارے درمیان وہ جلوہ افروز ہے اور موجود نہیں بھی ہے۔ ہمارے گناہوں کا علم بھی رکھتا ہے اور ان سے اعراض بھی کرتا ہے۔''

''کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ میاں نہیں ہوتے ہوئے بھی ہیں، موجود، ناموجود، ہونے، نہ ہونے کا سوال نہیں اٹھتا؟''

شریف صاحب ذرا اچھل سے پڑے: کیا بات کہی ہے یار! آپ سرسیّد کی آواز ہیں!''

اتنے میں کچن سے شکنتلا کی آواز آئی: ''شریف آپ چائے کب بنانے والے ہو۔ میں حبیب کے لئے دوسے بنا رہی ہوں''۔

''مجھے نہیں ملے گی کیا؟'' کہتے ہوئے شریف صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ حبیب نے دیکھا کہ وہ اٹھتے وقت ذرا سا لڑکھڑائے تھے۔ شریف بھائی بولے: ''بھائی حبیب میاں صاحب ضعف طاری ہونا ایک زحمت بھی ہے اور رحمت بھی۔''

''رحمت کیوں؟''

www.taemeernews.com

"بیوی زیادہ مہربان ہو جاتی ہے۔ ہاہا!"

نہ صرف چائے جنت الفردوس سے اتری تھی، بلکہ دوسے بھی۔ حبیب صاحب کو چٹنیاں مرغوب تھیں۔ دوسے کا ایک ٹکڑا شریف حسن کے حصے میں بھی آیا۔

سرِ شام حسبِ معمول کھانے کا خاص انصرام ہوا۔ شریف حسن نے اپنے جگری کے لئے نیم پارسی نیم ماژندرانی پلاؤ پکایا تھا۔ اس میں ڈھیر سی سبزیاں ڈالی گئی تھیں، مرغ کے ننھے ننھے پارچے تھے، وافر مقدار میں دھنیا، چھوٹے آلو تھے۔ بادام، کاجو، کشمش کے دانے اور خوبانی کی قاشیں تھیں۔ زعفران ہلکی سی ڈالی گئی تھی۔ کوفتے بھی تھے، کشمیری طرز کے، گاڑھے شوربے میں ڈوبے ہوئے۔

"والدہ مرحومہ سبز مرچ خاصی مقدار میں ڈالا کرتی تھیں۔ والد کہا کرتے جب تک آنکھ اور ناک سے پانی بہنے نہ لگے کوفتوں کا لطف ہی کیا۔ مجھے مرچوں سے زیادہ رغبت نہیں۔ خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو جایا کرتا ہوں۔"

حبیب صاحب بولے۔ "بھائی جان آپ کوفتے بے شک انتہائی لذیذ پکاتے ہیں۔"

کھانے میں سلاد تو تھے ہی، شگفتہ بھابی نے کئی قسم کی چٹنیاں بھی بنائی تھیں۔ خشکہ اور دہی موجود تھے جنھیں ملا کر غذا کے اخیر میں تناول کرنا جنوبی ہند کا باشندہ اپنا مذہبی اور تمدنی فرض سمجھتا ہے۔ چھاچھ بھی تھی۔ "والدہ کہا کرتی تھیں کہ کوفتوں کے بعد ڈھیر سا مٹھا پینا چاہیے۔ شاید اس لئے کہ مرچ کی تیزی کے لئے تریاق کا کام کرے۔"

شریف بھائی کی غذا انتہائی سادہ تھی۔ ابلا ہوا چکن، ابلی سبزیاں۔ ایک بھنا آلو۔ ایک توس۔ اور نصف گلاس سرخ وائن۔ سائیڈ ربھی تھی۔ "کوک لیں گے آپ بائی صاحب؟" شگفتہ نے پوچھا تھا۔

"جی نہیں بھابی۔ میٹھا کیا کھلا رہی آپ اپنے دیور کو؟"

"دیکھتے جاؤ میاں صاحب۔ عموماً آئس کریم اور فروٹ نوش فرمایا کرتی ہیں۔ میں تھوڑا پلاؤ ضرور کھاؤں گا۔ دیکھوں ماژندرانی رکاب دار اپنے فن کو کس قدر بھولا ہے، کس قدر یاد رکھتا ہے۔ کوفتے تو مجھے ملیں گے نہیں!"

کھانے کے بعد خالص تامل کافی پینے کے دوران شگفتہ نے شاہ رخ خاں کی ایک فلم وی۔ سی۔ آر پر لگائی۔ اس کا شہرہ تمام پھیل چکا تھا۔ شریف بھائی نے عینک اتار دی۔ "بھائی ہم ازمنہ قدیم کے ہیں۔ کیا آپ حبیب میاں صاحب مووی دیکھ رہے ہیں؟"

"حکم حاکم!"

شریف خلاف معمول ذرا زور سے ہنسے۔ "آپ جانتے ہیں دلیپ کمار ہمیشہ سے میرا ہیرو رہا۔ یہ لڑکا بھی نئے طور پر اسی جیسا ہے۔"

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔ حبیب میاں صاحب تین دن مذاکرات میں مشغول رہے۔ "شریف بھائی قدیم ایرانی زبانوں کی بابت میرا پیپر ہے۔ میں تہذیبی اور تمدنی اثرات کا جائزہ لے رہا ہوں۔ آریاؤں کے ایران میں داخل ہونے سے پیشتر کوئی ۲۰۰۰ قبل مسیح میں عراق و شام کے اثرات زیادہ اہم رہے ہیں۔"

حبیب صاحب مزید دو دن شریف صاحب کے یہاں رک گئے۔ نئی کتابوں کی ایک نمائش دیکھنے گئے۔ گھر پر بیٹھ کر مستقل پرانے وقتوں کی یادیں تازہ کیں۔ "شریف بھائی جب میں علی گڑھ گیا تھا تو مڈرائٹ کا طوفان کم ہو چلا تھا لیکن انٹروڈکشن کی سرگرمیاں اسی طرح باقی تھیں۔ بڑے ہی لطف کی چیز تھی۔"

"ہاں بھئی ملیگی انٹروڈکشن کا کوئی جواب نہیں۔ ایک مخصوص تہذیبی جلوہ کارفرما تھا وہاں۔"

"میں آپ کو بتاؤں شریف بھائی۔ نورتھ ایرے سے میں بھی سمجھنے لگا تھا کہ مجھے حق پہنچتا ہے نئے بچوں کا انٹروڈکشن لوں۔ ایک بار ایک صاحبزادے آئے۔ دبلے پتلے، پچیلے۔ رنگ صاف، آنکھیں بڑی بڑی۔ ایک کرسی پر کھڑا کیا گیا۔ صاحبزادے ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے، بال پریشان۔ میں نے دریافت کیا:

'پارٹنر آپ کی غذا کیا ہے۔ کیا محض اشک بلبل پر گذارہ ہے!'

ایسا قہقہہ پڑا کہ آفتاب ہاسٹل تک آواز پہنچ گئی ہوگی۔ صاحبزادے صاحب نے آنکھیں جھکائیں:

'نہیں جناب، خون جگر کے گھونٹ پیتا ہوں!'

"وہ صاحبزادے صاحب ڈاکٹر بنے اور آج کل گلاسکو میں پریکٹس کرتے ہیں۔"

عظیم ہستیوں کی بات چل نکلی۔ "شریف بھائی آپ کسے عظیم ترین انسان تسلیم کرتے ہیں؟"

"میں پیغمبروں کی بات نہیں کرتا۔ ورنہ تین عظیم ترین ہستیاں وجود میں آئی ہیں۔ ایک فلاطون، دوسرا کنفیوشس، اور تیسرے گوتم بدھ۔ آپ کہیں گے کہ آخری دو کو پیغمبر بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ ہاں یہ ایک حد تک درست ہے لیکن یہ دونوں قطعی طور پر ارضی اور انسانی سرد کاروں کے لوگ تھے۔ انھوں نے انسانی فلاح کی بابت فکر کیا۔ افلاطون نے تو نہ صرف معاشرے کو بہتر بنانا چاہا بلکہ انسانوں کا رشتہ نورایزدی سے بھی جوڑنا چاہا۔"

حبیب صاحب جب لندن کی جانب محو پرواز تھے تو "پلے بوائے" کا تازہ شمارہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے شریف حسن کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ چند دن کے بعد شاید انھیں کوئی یاد نہیں رکھے گا۔ لیکن چمن میں ایسا پھول برسوں بعد کھلتا ہے۔ شرافت، حیا، تہذیب، شعور، عشق و عقل کی یک جائی، قلب تصوریزداں کے نور سے منور۔

حبیب میاں صاحب نے رسالے کو گود میں رکھ لیا، پشت پیچھے ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔ ان کے ذہن میں ایک یوں ہی سا شعر ابھرا جسے انھوں نے علی گڑھ نمائش کے ایک مشاعرے میں سنا تھا

ہائے وہ نغمہ جس کا مغنی   روتا جائے گاتا جائے

☆☆☆

پریمل، اور پانچ دہائی پہلے الٰہ آباد کے شب و روز

بشن ٹنڈن، ترجمہ نجم فاروقی

میں الٰہ آباد میوزیم کے صدر اور دیگر عہدے داران کا مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے اس گفتگو کا موقع دیا۔ یہ میوزیم اب الٰہ آباد کی ادبی نیز ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا ہے۔ یہاں آکر اس میوزیم کے بانی مبانی جناب برج موہن ویاس کی یاد آنا فطری بات ہے۔ میرے خاندان کے ان سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ بچپن سے ہی میں نے انھیں اپنے گھر آتے جاتے دیکھا تھا۔ میرے والد کو وہ ہمیشہ ان کے گھر کے نام سے پکارتے تھے۔ اپنے وقت میں وہ الٰہ آباد کی انتظامیہ اور ادبی حلقوں کی ایک اہم شخصیت تھے۔ الٰہ آباد میں انڈین ہسٹری کانگریس کے ایک جلسے کی استقبالیہ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ اس کانگریس میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ الٰہ آباد کو ایک حقیقی تہذیبی اور تمدنی میراث دینے کے لئے انھوں نے کس طرح اس میوزیم کو قیام، تعمیر، اور وسعت دی، اس کا بیان نہایت دلچسپ ہے۔ میں نہایت عقیدت سے انھیں سلام کرتا ہوں۔

آج کے موضوع پر آنے سے پہلے میں میوزیم کے معزز عہدہ داران سے معافی کا خواستگار ہوں۔ ان کا دعوت نامہ قبول کرنے کے بعد مجھے یہاں آنے میں ناقابل معافی تاخیر ہوئی ہے۔ درحقیقت مجھے گذشتہ سال سردیوں میں ہی یہاں آنا چاہیے تھا۔ میری اپنی کاہلی تو اس کی اصل وجہ ہے ہی، لیکن ایک اور چھوٹی سی بات اس پروگرام کو ٹالتی رہی۔ میں جس موضوع پر آج آپ کے سامنے گفتگو کرنے جا رہا ہوں اس پر میرے پاس کوئی تحریری مسالہ نہیں تھا اور نہ آج ہی ہے۔ جب میں نے پرانے دوستوں سے اس وقت کے کاغذات کے بارے میں پوچھا تو سب نے یہی کہا کہ وہ تو کسی اور کی تحویل میں ہیں۔ آخر میں محض اس بات کی تصدیق ہو سکی کہ کچھ پرانے رجسٹر، کاپیاں وغیرہ کنہیا لعل ٹنڈن کے پاس ہیں۔ انھوں نے انھیں تلاش کرنے کا وعدہ کیا، لیکن ان کے ممبئی چلے جانے کے باعث یہ اب تک ممکن نہ ہو سکا۔ اب اپنی یادداشت کی بنا پر میں ''پریمل'' (Parimal) کے قیام کی کہانی کہنے جا رہا ہوں۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ میں اپنی یادداشت پر پورا بھروسا کر سکتا ہوں۔

کچھ سال قبل دھرم ویر بھارتی کی اڑتالیسویں سالگرہ پر ان کے کچھ دوستوں نے ان کے اعزاز میں ایک کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کتاب ''بھارتی: سنگم سے ساگر'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ مجھے بھی اس میں کچھ لکھنے کے لئے کہا گیا۔ جس طرح میں آج کے پروگرام کے لئے بہت دن تک کچھ نہیں لکھ سکا، اسی طرح اس کتاب کے لئے بھی میں نے کچھ نہیں لکھا۔ پھر ایک دن بھارتی کی ایک دوست نے، جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری سنبھالی تھی، صبح صبح مجھے فون کر کے سخت شکایت کی تو ایک دو دن میں ہی مجھے اپنا مضمون بھیجنا پڑا۔ میں نے اس میں غلطی سے یہ لکھ دیا کہ ''پریمل'' کے قیام کی کہانی پھر کبھی لکھوں گا۔ ستیہ پرکاش مصرا نے اس کی بنا پر گذشتہ سال مجھ کو گھیر لیا کہ اب وہ کہانی سنا ہی ڈالو۔

''پریمل'' کے قیام کی کہانی بہت چھوٹی اور سیدھی سادی ہے۔ اس کو لکھنے کا ارادہ میں نے کئی بار کیا، خصوصاً اس لئے کہ اس کے بارے میں وقتاً فوقتاً ایسی باتیں کہی گئی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ''پریمل'' کے جشن سیمیں (سلور جوبلی) کے بعد شائع یادگاری مجلّے کو دیکھ کر بھی مجھے بہت تعجب ہوا۔ اگر اس وقت، جب ''پریمل'' سے متعلق پرانے کاغذات آج کی بہ نسبت آسانی سے حاصل ہو سکتے تھے، کچھ لکھا جاتا، تو ''پریمل'' کے قیام کی کہانی صحیح ڈھنگ سے بیان ہو سکتی تھی۔ لیکن اس مجلّے میں بھی کچھ ایسی باتیں کہی گئیں جو، میں نہایت قطعیت سے کہہ سکتا ہوں، صحیح نہیں ہیں۔ ''پریمل'' کا دستور کیا تھا، کون کب اس کا رکن بنا، کون اس کا کب Coordinator رہا، وغیرہ باتیں اس میں صحیح نہیں لکھی گئی ہیں۔ خیر اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن کچھ حلقوں میں اس کے قیام کے مقاصد اور سرگرمیوں کے بارے میں کبھی کبھی بڑی غلط باتیں کہی گئی ہیں۔ میں اس سلسلے میں صرف ایک مثال دیتا ہوں کہ الٰہ آباد میوزیم کے انتظام و انصرام میں دیے گئے اپنے ایک خطبے میں سید محمد عقیل رضوی نے کہا ہے کہ:

> اس صدی کی چھٹی دہائی میں ایک انجمن ''پریمل'' بڑی زور و شور سے بنی، اس کے روح رواں تو اصلاً دھرم ویر بھارتی، بشن نرائن ٹنڈن اور جگدیش گپت تھے، مگر اس میں (الٰہ آباد) یونیورسٹی کے شعبہ ہندی کے تقریباً سارے اساتذہ، خاص طور پر نئی نسل کے لوگ شامل تھے، جس میں ڈاکٹر رام سروپ چترویدی اور انگریزی کے شعبہ کے وجے دیو نارائن ساہی خاص تھے۔ شاید یہ اگیے جی کی نئی نظم کی مہم سے متاثر تھے اور درپردہ الٰہ آباد میں جو ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا بڑا زور تھا اس کے توڑ کے لئے بھی یہ انجمن بنی تھی۔ کم سے کم دھرم ویر بھارتی تو سخت اینٹی پروگریسو تھے اور اعلانیہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو برا بھلا کہتے تھے۔ کچھ دنوں تک تو اس انجمن کے جلسے

www.taemeernews.com

بڑے زور شور سے ہوئے مگر دو ایک سال بعد اس میں وہ گرمی باقی نہ رہی اور انجمن ختم ہو گئی۔

اس میں کئی غلط باتیں کہی گئی ہیں۔ لیکن میں کسی کی تنقید کرنا نہیں چاہتا اور اپنے علم کے مطابق "پریمل" کے قیام کے حقائق آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ "پریمل" کے قیام کے پس منظر میں کون سا جذبہ کارفرما تھا، یہ خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔

پچاس سال قبل کا الہ آباد سیاست، ادب اور تمدن کا نہایت اہم مرکز تھا۔ اس کی تفصیل یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے پس منظر میں خاص طور پر آنند بھون اور کانگریس، ہندی ساہتیہ سمیلن، انجمن ترقی اردو، انڈین پریس لمیٹڈ، بھارتی بھنڈار، کتابستان، یونیورسٹی، اور ہائی کورٹ تھے۔ اگر ایک طرف سیاست دانوں کا جمگھٹ اور ان کا آنا جانا تھا، تو دوسری طرف یہ ادیبوں اور فنکاروں کے لئے بھی ایک طرح کا قبلہ تھا۔ یونیورسٹی اور پریاگ سنگیت سمیتی کے سنگیت جلسوں کی دھاک پورے شمالی ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ سیاسی، سماجی، ادبی اور معاشرتی سرگرمیوں نے مل کر ایک بڑا شائستہ ماحول بنا دیا تھا۔ عوام نہ صرف اس سے متاثر تھے بلکہ اس سے پوری طرح منسلک بھی تھے۔ اس وقت کے کئی چوٹی کے فنکاروں نے کہا ہے کہ انھیں اپنے فن کے اظہار کے لئے الہ آباد میں بڑی طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس زمانے میں انگلینڈ کی مختلف یونیورسٹیوں کی ایک مذاکراتی ٹیم ہندوستان آئی تھی اور جن تین چار شہروں میں وہ ٹیم گئی ان میں الہ آباد بھی تھا۔ اسی طرح، اس وقت انگلینڈ کے ایک مشہور "شیکسپیر گروپ" نے ملک کے کئی شہروں کا دورہ کیا تھا۔ الہ آباد میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا سے بھی ان کا تبادلہ خیال ہوا اور پیلیس تھیٹر (الہ آباد کا ایک معروف سینما ہال) میں اس گروپ کا عوامی جلسہ ہوا۔ گروپ کے صدر نے مجھ سے کہا کہ جتنے اچھے اور سمجھدار شائقین انھیں الہ آباد میں ملے، اتنے اور ویسے اور کسی شہر میں نہیں ملے۔

یونیورسٹی کے بارے میں کچھ اور ذکر بعد میں کروں گا، لیکن اس کے باہر بھی بہت کچھ ہوتا رہتا تھا۔ پانچویں دہائی میں ہی شہر کے ایک ذی شان تہذیبی ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ وہ "الہ آباد کلچر سینٹر" کہلاتا تھا۔ اس میں مختلف فنون کے الگ الگ شعبے تھے، جیسے، مصوری، موسیقی، مغربی سنگیت، رقص، ڈراما وغیرہ۔ ان کے پروگرام الگ الگ ہوتے تھے۔ کئی سال تک ان شعبوں کی سرگرمیاں بہت تیز رہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب الہ آباد یونیورسٹی کی عظمت وقدر کا ڈنکا پورے ملک میں بج رہا تھا۔ چالیس سال قبل جب میں حکومت ہند میں ایک نوعمر افسر تھا تو ایک فائل کے اندراجات دیکھ کر خوشی سے گویا سرشار ہو گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران ہندوستان کے نوجوان آئی۔ سی۔ ایس افسروں کو ابتدائی تربیت کے لئے انگلینڈ بھیجنا بند کرنا پڑ گیا تھا۔ فائل میں یہ مسئلہ زیر غور تھا کہ اس تربیت کو ہندوستان ہی میں انجام دیا جائے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر امر ناتھ جھا نے حکومت ہند کو لکھا کہ ہماری یونیورسٹی اس تربیت کے لئے ہر طرح کی سہولت مہیا کر سکتی ہے۔ اس خط پر جن افسروں نے اپنی آرا قلم بند کی تھیں ان میں الہ آباد کا کوئی نہیں تھا۔ ایک مدراس کے تھے، باقی سب انگریز تھے۔ سب نے تسلیم کیا تھا کہ ملک میں یہی ایک یونیورسٹی اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ لیکن آخر میں الہ آباد کے موسم کی وجہ سے، اور اس وجہ سے کہ یہ شہر قوم پرست سیاست کا مرکز تھا، اس تربیت کا انتظام دہرہ دون میں کیا گیا۔

صرف تعلیمی حلقوں میں ہی نہیں، بلکہ دیگر حلقوں میں بھی اس یونیورسٹی کی سرگرمیاں سرخیوں کا موضوع بنتی تھیں۔ کلاس روم اور نصاب سے باہر متعدد کلب، انجمنیں، ریسرچ سرکل وغیرہ کے زیر اہتمام لیکچر، بحث مباحث، مذاکرات، شعر وافسانہ کی نشستیں، شام موسیقی وغیرہ پروگرام نئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ یونیورسٹی کے دانشوروں اور ثقافتی حلقوں میں بھی ان اداروں کا بہت اثر تھا۔ ان میں فرائی ڈے کلب Friday Club جس کی بیٹھک کبھی جمعہ کو نہیں ہوتی تھی، فاونڈیشن کلب Foundation Club، آگسٹ کلب August Club یونی ورسٹی ڈرامٹک سوسائٹی، شیکسپیر سرکل بے حد فعال اور مقبول تھے۔ اساتذہ اور طلبا دونوں اس میں شریک ہوتے تھے اور ان کی رکنیت کے بہت شائق رہتے تھے، لیکن ان سب سرگرمیوں میں بول بالا انگریزی کا تھا۔ ان تنظیموں کے تقریباً سبھی پروگرام انگریزی میں ہوتے تھے۔ ان میں مدعو مہمان، مقرر، قلم کار وغیرہ سبھی اسی زبان کو اہمیت دیتے تھے۔ شعبہ ہندی کے ہندی پریشد کے علاوہ ہندی کے دانشوروں، مصنفوں، یا شاعروں کو ان محفلوں میں بہت کم بلایا جاتا تھا۔ لیکن سال بھر میں ہندی پریشد کی بیٹھکیں ہی کتنی ہوتی تھیں، تین یا چار اور وہ بھی رسمی جلسوں کی شکل میں۔ لیکچر تھیٹر میں مقرر کے استقبال کے بعد اس کا خطبہ ہوتا تھا، کچھ سوال پوچھے جاتے تھے اور جلسہ ختم۔ اس میں مذاکرات کا کوئی گذر نہیں تھا۔

ہندی پریشد کی منعقد کردہ کوئی شعری نشست یا افسانہ خوانی کی نشست مجھے یاد نہیں۔ یونین اس کمی کو کچھ پورا کرتی تھی۔ یونیورسٹی کے جشن طلائی (گولڈن جوبلی، ۱۹۴۷) کے موقع پر جشن کمیٹی نے ایک بڑے کوی سمیلن کا انتظام کیا تھا۔ یونیورسٹی کے باہر بھی اس طرح کے پروگرام اکثر ہوتے رہتے تھے لیکن ان میں نوجوانوں اور طلبا کی شرکت کم ہوتی تھی۔

یونیورسٹی ڈرامٹک سوسائٹی کے سالانہ ڈرامے انگریزی میں ہوتے تھے۔ چوتھی دہائی میں ہندو ہاسٹل کے ہندی ڈراموں نے خاصی شہرت حاصل کی تھی۔ لیکن ۱۹۳۷ / ۱۹۳۸ کے بعد ڈرامے دھیرے دھیرے بند ہو گئے۔ اس کے بعد ایک آدھ موقع کو چھوڑ کر شاید ہی کبھی کسی ہاسٹل میں ہندی ڈراما یا ایک ایکٹ کا ڈراما اسٹیج کیا جاتا ہو۔ اس وقت آل انڈیا ریڈیو (تب آکاش وانی لفظ مروج نہیں تھا) کی پالیسی نے بھی، یعنی ہندی کی طرف سے اس کے بے اعتنائی نے، ماحول کو کچھ اور کڈھب کر دیا تھا۔ بہت لوگوں کو یاد ہوگا، ریڈیو کی اس وقت کی زبان کے متعلق پالیسی سے ہندی والے بہت غیر مطمئن تھے۔ ہندی کے قدآور دانشوروں اور ادیبوں کی اپیل پر ہندی والوں نے آل انڈیا ریڈیو کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔

www.taemeernews.com

اس معاشرتی اور مجموعی پس منظر کے برخلاف ذاتی سطح پر ہندی ادب کا ذخیرہ روز افزوں ترقی پر تھا۔ چھایاوادی عہد تقریباً اختتام پر تھا، نئی نسل کے شاعر اور ادیب پر اعتماد لہجے میں اپنی بات کہہ رہے تھے۔ بچن، رام دھاری سنگھ دنکر، نریندر شرما، رامیشور شکل آنچل، ہندی شاعری کو ایک نئی جہت اور نئی سوچ عطا کر رہے تھے۔ نثری ادب میں بھی کچھ کم ترقی نہیں ہو رہی تھی۔ بھگوتی چرن ورما، اگیئے، بھگوتی پرشاد باجپئی، رام کمار ورما، بھوونیشور، جگدیش چندر ماتھر، مختلف ادبی راہوں کو مالا مال کر رہے تھے۔ یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ان سبھی نے نئے اور نوجوان طبقے کے شاعروں اور ادیبوں کو بہت متاثر کیا تھا۔

یونیورسٹی میں بھی بہت سے ابھرتے ہوئے شاعر، کہانی کار، ڈراما نگار فعال تھے۔ الہ آباد کے باہر شعری نشستوں اور دیگر ادبی پروگراموں میں ان کی مانگ تھی۔ کچھ نام مجھے ابھی تک یاد ہیں جیسے منوہر چترویدی (جو بعد میں پولیس افسر ہوئے) راجیند رورما، دھننجے چترویدی، کرپا شنکر شرما، رمیش شرما وغیرہ۔ ہندی ماہ ناموں کا عالم آج کی جیسی کسمپرسی کا نہیں تھا۔ ''سرسوتی'' اور ''وشال بھارت'' کے علاوہ ''ابھیودے'' اور ''سنگم'' جیسے متوسط درجے کے رسالے تخلیقی ادب کی ترویج و توسیع میں سرگرم تھے۔ کچھ چھوٹے پرچے بھی خاصے اہم تھے۔ ان میں سے کچھ تو مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ نئے کٹرہ سے دادو جی خود دوڑ دھوپ کر کے ''ترون'' نکالا کرتے تھے۔ ہندی کی جدید زبان پر فراق صاحب کے تیکھے تنقیدی افکار کی حمایت اور مخالفت میں جو مباحثہ ہوا وہ اسی پرچے کے ذریعہ ہوا۔ اتنا سب ہوتے ہوئے بھی آپس میں بحث مباحثے کے ذریعہ اپنی بات کہنے اور دوسروں کی زبان سمجھنے کے کسی منصوبہ بند پلیٹ فارم اور مواقع کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

''پریمل'' الہ آباد کے اپنے ادبی اور معاشرتی پس منظر اور حالات کی پیداوار تھا۔ اس گفتگو کی تیاری کے لئے جب میں اپنی ڈائری الٹ پلٹ رہا تھا تو مجھے ایک تحریر ملی۔ یہ شاید ۱۹۵۶ کی بات ہے۔ دھرم ویر بھارتی، جگدیش گپت، اور وجے دیو نرائن ساہی دلی آئے ہوئے تھے اور اگیئے کے ساتھ ساؤتھ اوینیو میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں وہاں ان سے ملنے گیا تھا، اس کا ذکر میری ڈائری میں ہے۔ قصہ مختصر، جب میں وہاں ان کے پاس گیا تو کچھ دیر بات چیت کے بعد ساہی مجھے الگ بیٹھے ہوئے اگیئے کے پاس لے گئے اور بولے:

''اگیئے جی، آج آپ کو ایک تاریخی شخصیت سے ملاتے ہیں۔ یہی ''پریمل'' کے بانی مبانی ہیں۔''

بات دوستی کے زیر اثر مبالغے کے صیغہ میں کہی گئی تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ ''پریمل'' ہم دونوں کی دوستی سے ہی وجود میں آیا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۱ میں ہم دونوں نے گورنمنٹ کالج الہ آباد میں داخلہ لیا۔ ہمارے مضامین مختلف تھے لیکن کچھ ہی دنوں بعد ہم لوگوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ وجے کے ایک بڑے بھائی یونیورسٹی میں میرے والد کے شعبے میں ریسرچ اسکالر تھے۔ وجے کرنل گنج میں مسلم ہاسٹل اور میور سینٹرل کالج کے پیچھے رہا کرتا تھا اور میں نئے کٹرہ میں مکان نمبر ۱۲۰ اے، بیلی روڈ پر۔ وجے نہایت ذہین اور باصلاحیت طالب علم تھا۔ اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اس کے ساتھی، بلکہ دیگر لوگ بھی غیر شعوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وجے شاعری کرتا تھا اور اپنا ایک گیت 'وہ پرانی بات ساتھ ساتھی' بڑے میٹھے اور خوب صورت لہجے میں سنایا کرتا تھا۔ وجے ہندی کا نہیں بلکہ فارسی کا طالب علم تھا۔ ہائی اسکول میں بھی اس نے اردو اور فارسی پڑھی تھی اور بعد میں انٹر اور بی۔اے میں بھی فارسی اس کا اختیاری مضمون تھا۔

اگلی جولائی میں گرمی کی چھٹی کے بعد وجے کا خاندان بھی نئے کٹرے میں بیلی روڈ کے ایک مکان میں رہنے لگا۔ محض ایک چھوٹی سی کھڑنجے والی گلی پار کر کے ہم دونوں پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں ایک دوسرے کے گھر آ جا سکتے تھے۔ پھر کیا تھا، دن بھر کا ساتھ ہو گیا۔ اس سال پہلے 'بھارت چھوڑو' آندولن کا زور رہا۔ اس کے کچھ ٹھنڈا پڑنے کے بعد ہم دونوں کا سارا وقت ادب، خصوصاً ہندی ادب سے وابستہ سرگرمیوں میں ہی گذرنے لگا۔ اس وقت نئے کٹرہ میں خصوصاً اے بیلی روڈ پر کئی معروف ادیب رہتے تھے۔ میرے گھر سے دو تین گھر چھوڑ کر سرسوتی کے اس وقت کے مدیر شکل جی، ان کے ٹھیک سامنے پہاڑی، اور ان کے گھر سے ملحق گھر میں بھگوتی چرن ورما تھے۔ تھوڑا آگے چل کر ڈاکٹر رما شنکر شکل 'رسال' اور ان کے ساتھ ان کے بھائی 'سرس' تھے جو خود برج بھاشا کے اچھے شاعر تھے۔ ۸ اے بیلی روڈ پر ہی پروفیسر سری رنجن کے بنگلے کی ایک چھوٹی کاٹیج 'بسودھا' میں سمترا نندن پنت اور بچن، بیلی روڈ سے پھوٹنے والی سڑک پریاگ اسٹریٹ پر ذرا آگے چلیں تو رام کمار ورما تھے۔ اسی طرح کا ملتا جلتا جمگھٹ دارا گنج میں بھی تھا۔ یہاں پنڈت سری نراین چترویدی کے گھر آ کر نرالا اکثر ٹھہرا کرتے تھے۔ وجے کا اور میرا ایک معمول سا بن گیا تھا کہ شام کو کسی نہ کسی ادیب سے ملاقات کے لئے جاتے تھے۔ پنت اور بچن سے ملاقات اکثر ہوتی، اگرچہ وہ لوگ بیلی روڈ چھوڑ کر بینک روڈ پر آ گئے تھے۔

کالج میں بھی زیادہ تر وقت ادبی گفتگو اور شعر و شاعری میں ہی گذرتا۔ ہندی ساہتیہ سبھا کی سرگرمیوں میں بھی ہم لوگ خصوصی دلچسپی لینے لگے تھے۔ ہمارا ایک ہم جماعت اور تھا، جگدیش نرائن دویدی 'ایش' جو برج بھاشا میں اچھی شاعری کرتا تھا۔ بعد میں و.جی (وجے دیو) ہندی کے ریتی کال (کلاسیکی عہد) کی شاعری میں بہت غرق ہو گئے لیکن ان دنوں ہلکے پھلکے ماحول میں، خصوصاً ایش کو چڑانے کے لئے ہم لوگ برج بھاشا کی شاعری کا مذاق اڑاتے تھے۔ ایک بار وجے اور ایش میں ٹھن گئی۔ دونوں نے طے کیا کہ ایک ہی موضوع پر ایک برج بھاشا میں نظم کہے گا اور دوسرا کھڑی بولی میں۔ موضوع طے ہوا تھا 'شیش میگھ لریں جھرے سمیا'۔ انٹرول کے دوران کلاس میں اچھی خاصی بیٹھک جمی۔ اس سال ہم لوگوں کی کوششوں سے کالج میں نظم، کہانی، اور یک بابی ڈراموں کے کئی پروگرام ہوئے اور وہ کامیاب بھی ہوئے۔

اگلے سال ہم دونوں یونیورسٹی پہنچ گئے۔ ہم دونوں کے مضمون مختلف تھے اس لئے کلاسیں بھی الگ الگ ہوتی تھیں۔ لیکن میل ملاقات پہلے ہی کی طرح

www.taemeernews.com

رہی۔ اگر چہ وجے اب نئے کپڑے کے بجائے کاسٹھ پاٹھ شالہ یونیورسٹی ہاسٹل میں آ گیا تھا، پھر تقریباً روز ہی ہمارا ملنا ہوتا۔ اگر میں اس کے ہاسٹل نہ پہنچ پاتا تو وہ خود نئے کپڑے چلا آتا تھا۔ بی۔ اے کے دوسرے سال میں آتے آتے (۱۹۴۴/۱۹۴۵) ہندی، اور ادب، ہم دونوں پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں گردھر گوپال بھی ہماری ٹولی میں آملا۔ گردھر بھی نئے کپڑے میں اے۔ بیلی روڈ پر میرے مکان سے چھ سات مکان چھوڑ کر اپنے بابا اور والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا اور بھگوتی بابو کا مکان ایک دوسرے سے ملحق تھے۔ اس نے ہم لوگوں کے ساتھ ہی گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تھا لیکن وہ چونکہ سائنس کا طالب علم تھا لہٰذا شروع میں ہمارا اس کا بہت قریبی تعلق نہیں بن سکا تھا۔ انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد اس نے سائنس چھوڑ دی اور بی۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ ہم لوگوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ گردھر شعر کہنے لگے گا، لیکن دسمبر ۱۹۴۳ میں یکا یک 'سندھیا نے ورگ موند لیے، روی لیتا رجنی کا چمبن' [سورج کو رات کا بوسہ لیتے دیکھ کر شام نے شرم سے آنکھیں موند لیں، مترجم] کے ساتھ جو اس کا لب و لہجہ ظاہر ہوا تو ایک لمبے عرصے تک اس نے ایک کے بعد ایک بہت سے اچھے گیت لکھے جن کی راتوں رات دھوم مچ گئی۔

یونیورسٹی کی سرگرمیوں سے ہمارا اچھا خاصا تعلق پہلے سال ہو گیا تھا۔ دوسرے سال ہم لوگوں کے افکار کچھ ٹھوس شکل اختیار کرنے لگے۔ ہم نے سوچا کہ ہندی پریشد کو زیادہ فعال بنایا جائے۔ اگر چہ یونیورسٹی کا کوئی بھی طالب علم اس کا رکن ہو سکتا تھا، لیکن شعبہ ہندی کے باہر کے طالب علم اس میں کم ہی آتے تھے۔ ہم لوگوں نے ایک ہزار سے زیادہ رکن بنوا دیئے۔ اس کے انتخاب میں یونین کے الیکشنوں کا رنگ آ گیا (یونین ان دنوں معطل تھی)۔

ہمارے حمایتی اراکین انتخابات میں نہ جیت سکے اور جو جیتے انھوں نے کام میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ ہم لوگ پریشد سے مایوس ہو گئے۔ اسی زمانے میں ہم لوگوں نے ڈرامیٹک سوسائٹی کو نئی شکل دینے کا فیصلہ کیا۔ سوسائٹی ہر سال انگریزی کے ہی ڈرامے کیوں کھیلتی ہے، کیوں نہ ہندی ڈراموں کا انعقاد کیا جائے؟ اس کے لئے ضروری تھا کہ ڈرامیٹک سوسائٹی میں ہم لوگوں کی بات سنی جائے۔ منظم طریقے پر ہم کئی دوستوں نے اس سوسائٹی میں اپنے نمائندوں کی تعداد بڑھائی۔ ان دنوں سوسائٹی کے صدر شعبہ انگریزی کے استاد بھگوت دیال تھے۔ ہم لوگوں نے اپنے ایک سینیئر ساتھی ہری موہن سری واستو کو سکریٹری منتخب کیا۔ انھوں نے وجے کو معاون سکریٹری نامزد کیا۔ میں اور گردھر گوپال دونوں مجلس عاملہ کے ممبر بنے۔ بھگوت دیال پورے صاحب قسم کے آدمی تھے۔ وہ اپنا نام بھی ''ڈایال'' کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے اور اگر انھیں کوئی ''مسٹر'' کے بجائے ''جناب عالی'' کہہ کر مخاطب کرتا تو ناراض ہو جاتے تھے۔ ایک ایسا ادارہ جس کے سارے کام کاج ابھی تک انگریزی میں ہوتے تھے اور جس کے اراکین بھی اس زبان کے زبردست حمایتی تھے، ان کے سامنے ہم لوگ کیا کر سکتے تھے؟

ہم لوگ فکر مند تھے۔ لیکن سوسائٹی کے پہلے ہی جلسے میں بے شکر پرساد کے ڈرامے ''چندر گپت'' کے حق میں ہم لوگوں نے مل کر زوردار تجویز کی۔ بھگوت دیال نے اس کی مخالفت کی۔ انھوں نے ''چندر گپت'' کو پڑھا نہیں تھا لیکن یہ سن رکھا تھا کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ پرساد کے ڈرامے اسٹیج کے لائق نہیں ہیں۔ لیکن آخر میں بات ہم لوگوں کی ہی رہی۔ فیصلہ ہو گیا کہ اس سال یونیورسٹی ڈرامیٹک سوسائٹی ''چندر گپت'' اسٹیج کرے گی۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ فیصلے کے بعد بھگوت دیال نے ہم لوگوں کی پوری مدد کی اور لمبے عرصہ تک ریہرسل میں بار بار آ کر ہم سب کی بہت افزائی کی۔ وجے، گردھر گوپال، مہیندر پرتاپ، دکاس چندر جین (جو بعد میں ضلع جج کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے)، کرشن مادھو چودھری انجان، ایشور چندر باجپائی، میں اور دیگر کچھ ساتھیوں نے دل و جان سے محنت کر کے ڈرامے کو بے حد کامیاب کرایا۔ اور یہ سب اس وقت جب بی۔ اے۔ فائنل کے امتحانات سر پر تھے۔ ڈراما فروری کے آخر اور مارچ کے اوائل میں اسٹیج ہوا اور بی۔ اے۔ کے امتحان مارچ کے آخری ہفتہ میں شروع ہونے والے تھے۔

اگلے سال بھگوت دیال حکومت ہند کے محکمے رسد میں چلے گئے اور ان کی جگہ پروفیسر ستیش چندر دیب نئے صدر مقرر ہوئے۔ وجے کے بڑے بھائی جے دیو سوسائٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ انھوں نے مجھے معاون سکریٹری نامزد کیا۔ وجے، گردھر اور کچھ دیگر دوست عاملہ میں رہے۔ ''اسکند گپت'' کو اسٹیج کرنے کی تیاری تھی لیکن کچھ مشکلوں کی وجہ سے اس سال صرف دو یک بابی ڈرامے اسٹیج کرنے کا پروگرام بنا۔ ''اورنگ زیب کی آخری رات'' اور جگدیش ماتھر کا ''بھور کا تارا'' پیش کیے گئے۔ ایک بار پھر غیر معمولی کامیابی کے باعث یونیورسٹی میں انگریزی ڈراموں کی دھاک بلکہ ساکھ پر بہت اثر پڑا۔

لیکن ہم لوگوں کے اصلی دوستوں کا گروپ ڈراموں کے میدان سے باہر ہی رہا۔ اس میں کچھ ارکان تو وہی تھے جو ''چندر گپت'' میں ہمارے ساتھ کام کر چکے تھے، لیکن اکثریت اوروں کی تھی۔ 'بھارتی: سنگم کے ساگر' میں شامل اپنے مضمون 'بھارتی کا تخلیقی سفر' میں دس سال قبل اس کا ذکر میں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''پریمل'' کا قیام تو بعد میں ہوا، لیکن دوستوں کے جس گروہ نے اس کے انتظام و انصرام میں خصوصی دلچسپی لی، اس کی تصویر میرے یونیورسٹی میں داخلے کے بعد سے ہی واضح ہونے لگی تھی۔ یونی ورسٹی میں ہمارا ٹولا ہندی-اردو شعبہ کے لمبے برآمدے کی سیڑھیوں پر، یا اس کے سامنے ڈاکخانے سے ملحق خوبصورت لان میں اکٹھا ہوا کرتا تھا۔ (اب ڈاک گھر کی پرانی عمارت کو توڑ کر کوئی نئی تعمیر ہو گئی ہے)۔ یا جب فرصت زیادہ ہوتی تھی تو، یا شعر پڑھنے سننے کا موڈ بنتا تھا تو، جہاں اب شعبہ ہندی کی نئی عمارت تعمیر ہوئی ہے اس کے پیچھے ایک پرانے کنویں کے پاس اڈہ جمتا تھا۔ وجی (وجے دیو نراین ساہی) گوپی کرشن گوپیش، دھرم ویر، جگدیش گپت، گردھر،

www.taemeernews.com

وغیرہ کے اس ٹولے میں کیشو (کیشو چندر ورما، ان سے میرا تعارف ''پریمل'' کے قیام سے دو سال قبل فیض آباد میں ہوا تھا اور جلد ہی ہماری دوستی گہری ہوگئی تھی۔ میں ان کی ادب اور موسیقی سے دلچسپی سے بہت متاثر تھا۔ ''پریمل'' کے دیگر اراکین سے ان کا تعارف بعد میں ہوا)، مہیندر پرتاپ اور سردیشور دیال سکسینہ بھی میں شامل ہوگئے۔ کبھی کبھی لکشمی کانت ورما بھی آبیٹھتے تھے۔ بات کچھ عجیب سی لگے گی، لیکن ہندی کی اس وقت کی کئی مقبول نظمیں پہلی بار اس کنویں کے پاس ہی پڑھی گئیں۔ مضمون کی تیاری کرتے ہوئے نہ جانے کتنی بار میں نے یہ مصرعے گنگنائے:

پریوی، سادھنا کے ہمانی شکھر پر
پرنے دیپ جلتا رہا ہے، جلے گا
(گردھر)

آج اکیلا میں جلتا، جلتا دیپک سرہانے
(گردھر)

میں ڈھونڈتا سویم کو کتنے پردیپ لے کر
میرے پردیپ روتے مجھ کو پرکاش دے کر
(مہیندر)

بھیک مانگ لی من نے، یدپی میں نے ہاتھ نہیں پھیلایا
اتر میں بھی کتنو سامنے سونا سونا آنچل آیا
یہی یاچنا مجھ میں آکر
مدھو مے دبھو لاس بن گئی
(مہیندر)

کون تم راکا پری سی
(جھیم)

یہ پان پھول سا مردل بدن
بچوں کی ضد سا الھڑ من
تم ابھی سکومل، بہت سکومل، ابھی نہ سیکھو پیار
(بھارتی)

تم چلیں پران، جیسے دھرتی پر لہرائے برسات
(بھارتی)

اور صبح کے پانچ بجے کی بھری بھری سی آنکھیں
(کوپش)

بے سدھ سی جنوسنگ بڑے بڑے بوندن کی ڈھلکی پریں آنکھیں
آننن سوں انکھیاں چھلکی پریں آنن سوں چھلکی پریں آنکھیں
(جگدیش)

درحقیقت شاعری کے میٹھے لہجے سے ہماری دوستی مضبوط ہوئی اور ''پریمل'' کا وجود ہوا۔ جگدیش گپت نے بھی ''پریمل'' پر اپنی رپورٹ میں اس اہم بات کا ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''پریمل'' کے ارکان پہلے دوست بنے، بعد میں ادیب۔ اسی لئے ادبی سطح پر ایک دوسرے سے اختلافات ہوتے ہوئے بھی ان کی دوستی میں کبھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں تو کہوں گا کہ ''پریمل'' کے اوائلی ارکان میں جو دوستی کی بیل پروان چڑھی تھی وہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ پھلتی پھولتی رہی۔ پہلی ہندی عالمی کانفرنس کے جلسے میں ''پریمل'' کے کئی پرانے ساتھی ناگپور پہنچے۔ پرانے دنوں کی باتیں آپس میں ہوئیں۔ جو وہاں نہیں تھے ان کی بہت یاد آئی۔ جگدیش اور ایک اور دوست نے صرف یہی بتانے کے لئے مجھے وہاں سے خط لکھے۔

ایک اور معاملے کا ذکر یہاں خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سب اس صوفی ادیب فادر کامل بلکے (Father Kamel Bulcke) سے اچھی طرح واقف ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد کامل بلکے نے الٰہ آباد میں اسی سال داخلہ لیا جس سال جگدیش بھارتی، گردھر اور میں نے لیا تھا۔ ''پریمل'' کا وہ ابتدائی دور تھا۔ کامل بلکے کو ''پریمل'' میں کس طرح لیا گیا، اس کا ذکر دھرم ویر بھارتی نے ان کے انتقال کے بعد (پندرہ روزہ) ''دھرم یگ'' میں ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا ہے۔ ''پریمل'' چھوڑنے کے بعد کامل بلکے سے میری ملاقات کم ہی ہوتی تھی اور الٰہ آباد بھی ہم دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ہی چھوڑا۔ بیس سال تک ہم میں پھر کوئی رابطہ نہ ہوسکا، اگرچہ ہم دونوں کو وقتاً فوقتاً یہ معلوم ہوتا رہا کہ ہم کہاں ہیں اور کیا کررہے ہیں۔ مجھے ایک بار ۱۹۷۲ میں شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ رانچی جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ بلکے صاحب اس وقت رانچی کے کسی مشنری اسکول Seminary میں تھے۔ ضلع حکام کے ذریعہ میں نے انھیں پیغام بھیجا کہ میں رانچی پہنچنے پر شام کو ان سے ملاقات کروں گا۔ پروگرام میں تبدیلی کی بنا پر میں رانچی شب میں بہت دیر سے پہونچا۔ بلکے نے رات کو ہی ہمارے سیمنری جانے کے سب انتظام کررکھے تھے۔ دس بجے کے بعد میں ان کے پاس پہنچا۔ وہ بڑی محبت سے ملے اور بہت جذباتی ہوگئے۔ کچھ دیر بات چیت کے بعد وہ اٹھے، پاس رکھے ہوئے ایک تھرمس کو اٹھایا، دو پیالیوں میں کافی انڈیلی اور ایک پلیٹ میں بسکٹ رکھ کر بولے:

''بشن جی، جب آپ الٰہ آباد میں سینٹ میری چرچ میں رات میں میرے مواعظ سننے آتے تھے تب بھی تو میرے یہاں یہی ملتا تھا۔ آج پھر اسی طرح آپ کا استقبال کررہا ہوں۔''

بہت دیر تک ہم دونوں پرانے دنوں اور ''پریمل'' کا ذکر کرتے رہے۔ اس کے بعد کامل بلکے جب بھی دلی آئے، ہمیشہ میرے گھر پر میرے ساتھ ہی ٹھہرے۔ اس قسم کی پرخلوص دوستی کا ذکر میں نے خاص طور پر اس لئے کیا ہے کہ یہ ''پریمل'' کا سب سے اہم جز تھی۔

اپنی بات پر واپس آتا ہوں۔ انہی دنوں میں ڈراموں میں سرگرمیوں

www.taemeernews.com

کے ساتھ ساتھ ہم لوگ اس پر بھی سنجیدگی سے غور کر رہے تھے کہ ایک چھوٹی سی انجمن قائم کی جائے جہاں ادب پر بے لاگ تبصرے کیے جاسکیں۔ آخر ایک طرح سے، چاہے ہلکے پھلکے اور غیر رسمی ڈھنگ سے، ہمارا دوستوں کا ٹولہ یہی کام کر رہا تھا، لیکن یہ محسوس کیا گیا کہ اس کو ایک رسمی، باقاعدہ شکل دی جائے تو اس کی کارکردگی میں کچھ زیادہ سنجیدگی آجائے گی۔ میں نے اوپر بعض انجمنوں یا کلبوں کا ذکر کیا ہے جو یونیورسٹی میں قائم تھے۔ ان میں فرائی ڈے کلب (FridayClub) اور فاؤنڈیشن کلب (Foundation Club) خاصے مقبول اور اہم مانے جاتے تھے۔ دونوں میں ہی اچھے پروگرام ہوتے تھے۔ اور ہم لوگوں کا خیال تھا کہ معیار کی اس بلندی کی خاص وجہ ان کی محدود رکنیت تھی۔ دونوں ہی میں، اور خصوصاً فرائی ڈے کلب میں رکنیت حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کلب کی Suobbery سے مجھے اور دجی دونوں ہی کو بہت چڑھ تھی۔ لیکن بڑے غور و خوض کے بعد یہ بات صاف ہونے لگی کہ اس قسم کی ایک انجمن ہندی میں بھی ہونی چاہیے۔ ڈرامیٹک سوسائٹی کی وجہ سے ہری موہن سری واستو میرے بزرگ ساتھی بن چکے تھے۔ ان سے ذکر کیا گیا تو انھیں یہ خیال بہت پسند آیا۔ پھر ہم ڈاکٹر راکیش گپت کے پاس پہنچے۔ وہ اس وقت شعبہ ہندی میں عارضی طور پر استاد تھے۔ انھیں بھی یہ خیال پسند آیا۔ اس طرح پہلی بیٹھک ۱۰ دسمبر ۱۹۴۴ کو نئے کٹڑے میں ہری موہن سری واستو کے گھر پر (وہ اس سال بی۔ بیلی روڈ پر آکر رہنے لگے تھے) ہوئی۔ گردھر گوپال سے میری اور دجی کی بات ہو چکی تھی۔ دستور کا کچھ خاکہ بھی ہم نے تیار کر رکھا تھا۔ بیٹھک میں کل آٹھ لوگوں سے حصہ لیا اور اس کی صدارت ڈاکٹر راکیش گپت نے کی۔ شرکائے بزم تھے، ڈاکٹر راکیش گپت، ہری موہن سری واستو، مہیش چندر چترویدی، اندر نرائن ٹنڈن، وجے دیو نرائن ساہی، گردھر گوپال، اور میں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے آٹھویں شخص رام چندر رما تھے۔ (مہیش چترویدی ۱۰ دسمبر کی بیٹھک کے بعد رکن نہیں رہے۔) اس جلسے میں انجمن کے نام پر کوئی فیصلہ نہیں لیا گیا، اور انجمن کے لئے کسی دیگر عہدے کا انتظام نہیں تھا۔ اگرچہ گوپیش، جگدیش گپت، بھارتی، کیشو، مہیندر پرتاپ، پہلے جلسے میں نہیں تھے لیکن ان سے بات ہو چکی تھی۔ صرف مہیندر پرتاپ نے شروع میں کچھ پس و پیش کیا تھا لیکن مارچ کا جلسہ ہونے تک وہ سب، اور ہمارے چند دیگر دوست بھی رکنیت اختیار کر چکے تھے۔

جولائی میں گرمی کی تعطیل کے بعد یونیورسٹی کھلنے پر ہری موہن سری واستو اور اندر نرائن ٹنڈن الہ آباد نہیں آئے۔ مجھے منتظم کار Coordinator منتخب کیا گیا اور میں نے گردھر گوپال کو اپنا معاون نامزد کیا۔ اگلے دو برسوں میں ہری موہن داس ٹنڈن، پرکاش چندر گپت، لکشمی ساگر وارشنے، گنگا پرشاد پانڈے، چندر بھوشن دویدی، رگھونش، کامل بلکے، شری پال سنگھ چھیم، اور اندر ساندھی نے رکنیت قبول۔ ڈراموں سے منسلک دو ایک دوست بھی رکنیت کے بہت متمنی تھے لیکن انھیں قصداً نہیں لیا گیا تھا۔ طریقہ یہ اپنایا گیا تھا کہ جن لوگوں کو ہم اپنا رکن بنانا چاہتے تھے ان کو کچھ نشستوں میں کوئی رکن اپنے مہمان کے طور پر مدعو کرتا تھا تاکہ دیگر اراکین ان سے متعارف ہو سکیں۔ جولائی ۱۹۴۶ کے بعد سر دیشور دیال بھی نئے کٹڑے میں رام چندر رما کے ساتھ رہنے لگے۔ انھیں بھی "پریمل" کا ممبر بنالیا گیا اور "پریمل" کے کام میں گردھر کے علاوہ میں ان کی بھی مدد لینے لگا۔ بھاگ دوڑ کا کام وہی کرتے تھے۔

نئے رکن بنانے میں ادب، اور لکھنے لکھانے میں دلچسپی کے علاوہ دوستی کے جذبے کو بھی بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ "پریمل" کچھ دوستوں کی خام ادبی دلچسپیوں کی ٹھوس شکل تھی تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ لیکن ادب میں دلچسپی کا معیار محض ہندی کا طالب علم ہونا نہیں تھا۔ چندر بھوشن دھر دویدی اور اندر ساندھی انگریزی کے طالب علم تھے، آگے چل کر ہم نے ریاضی کے ایک استاد ڈاکٹر اودے نرائن سنگھ (جو بعد میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے) کو رکن بنایا۔ ان دوستوں نے "پریمل" کی نشستوں میں مذاکرات کے لئے مقالے بھی لکھے۔

اب یہ ٹھیک یاد نہیں کہ "پریمل" نام کس نے تجویز کیا تھا لیکن نام طے ہو جانے کے بعد اس کا تصویری نشان (لوگو) Logo جگدیش گپت نے تیار کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، "پریمل" کی پہلی نشست جس میں کچھ ادبی کارروائی ہوئی، ڈراما 'چندر گپت' کے اسٹیج کیے جانے کے بعد اور یونیورسٹی کے امتحانات سے قبل مارچ ۱۹۴۵ میں ہوئی تھی۔ اس میں بچن جی بھی شریک ہوئے تھے۔ اس نشست میں اراکین کے علاوہ مہمانوں نے بھی اپنی نظمیں پڑھی تھیں۔ ۱۰ دسمبر کی بیٹھک کے بعد غیر رسمی گفتگو کے دوران "پریمل" کے دستور کو قطعی شکل دے دی گئی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں ہے، لیکن "پریمل" کا دستور ۱۹۵۲ یا ۱۹۵۳ میں شائع ہوا۔ لیکن ۱۰ دسمبر کی متذکرہ بالا بیٹھک ہوئی میں دستور منظور کیا جا چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک پہلی جلد کے رجسٹر میں، جس میں "پریمل" کا سب حساب کتاب رکھا جاتا تھا، شروع کے صفحات پر دستور لکھا گیا تھا۔ (اس کے علاوہ ایک کاپی اور ہوتی تھی سائز میں کچھ چھوٹی، جس میں "پریمل" کے جلسوں کی روداد لکھی جاتی تھی۔ نشست کی روداد منتظم کار لکھتا تھا اور ہر نشست میں پچھلی نشست کی روداد وہی پڑھ کر سناتا تھا۔ موجود اراکین کی عام رضامندی سے اس دن کی نشست کا صدر روداد کی منظوری و توثیق کے ثبوت میں آخر میں اپنے دستخط کرتا تھا۔)

یہ ممکن ہے کہ چند ابتدائی برسوں کے تجربے کی بنا پر ۵۳-۱۹۵۲ میں دستور میں کچھ تبدیلی کر کے اسے دوبارہ مرتب اور شائع کیا گیا ہو، لیکن جو دستور ۱۹۴۴ میں بنا تھا اس کا خاکہ کچھ اس طرح کا تھا:

> انجمن کے ارکان کی تعداد ۲۱ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ان کے علاوہ تین اعزازی ارکان ہوں گے: جناب سمترا نندن پنت، ڈاکٹر رما شنکر شکل رسال، اور ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن (ان کی رضامندی لے لی گئی تھی۔) انجمن کا کوئی صدر نہیں ہوگا، بلکہ ہر نشست کے لئے "پریمل" کے ہی کسی رکن کو صدر منتخب کر لیا جائے گا۔ عہدہ داران صرف دو ہوں گے: ایک منتظم کار، جس کا تقرر انتخاب کے ذریعہ ہوگا، اور دوسرا اس کا معاون جسے وہ خود نامزد کرے گا۔ نئے رکن کا انتخاب کثرت رائے سے، خفیہ

www.taemeernews.com

بیلٹ کیا جائے گا۔

یہاں مجھے اتنا ضرور کہنا چاہیئے کہ ''پریمل'' کا کام کاج کے چلانے کے سلسلے میں جن دوستوں میں آپس میں بات چیت ہوتی رہتی تھی ان میں دھرم ویر بھارتی، گردھر گوپال، جگدیش گپت، اور کیشو خاص تھے۔

''پریمل'' کے قیام کے پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے میں نے یونیورسٹی کے کلبوں کا ذکر پہلے کیا ہے۔ یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا ''پریمل'' بھی یونیورسٹی کے ایک کلب کی شکل میں ابھرا؟ اس کا جواب یہ ہے ''پریمل'' کا یونیورسٹی سے صرف اتنا تعلق تھا کہ اس کے زیادہ تر اراکین کسی نہ کسی شکل میں تھا یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ لیکن میرا اور و.جی کا یہ حتمی نظریہ تھا کہ ''پریمل'' کو یونیورسٹی کے کلب کی شکل میں قائم کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ہم لوگ اس کلب کو (چاہے اس کے اراکین مختلف شعبوں سے متعلق ہوں) یونیورسٹی کے قوانین کا پابند نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یونیورسٹی کا ہر کلب کسی نہ کسی شعبے کے زیر اہتمام کام کرتا تھا۔ یونیورسٹی کا کوئی پروفیسر اس کا صدر ہوتا تھا اور کلب کے سکریٹری کو اس کے احکام کے مطابق کام کرنا ہوتا تھا۔ یونیورسٹی سے باہر کا کوئی شخص ان کلبوں کی رکنیت نہیں اختیار کرسکتا تھا۔ باہر کے کسی شخص کو صدر کی اجازت کے بغیر بلایا نہیں جاسکتا تھا۔ ہمارے ذہن میں ''پریمل'' کی جو تصویر تھی وہ اس چوکھٹے میں ٹھیک نہیں بیٹھتی تھی۔ لیکن اس باعث ہمیں نشستیں کرنے کے لئے جگہ کی دقت بھی ہوتی تھی لیکن جلد ہی و.جی کی کوششوں سے کائستھ پاٹھ شالا نے اجازت دے دی کہ جلسوں کے لئے اس کا ہال کام میں لایا جاسکتا ہے۔ لیکن بعد میں ''پریمل'' کی نشستیں زیادہ تر بھارت بابو (بھارتیندو پرشاد ماتھر) کے الہ آباد کافی ہاؤس میں ہونے لگیں۔

''پریمل'' کے قیام کا مقصد کسی مخصوص ادبی نظریہ کی نشر و اشاعت نہیں تھی۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک میں ''پریمل'' میں رہا، ''پریمل'' کا کسی بھی موضوع پر کوئی اجتماعی پالیسی یا نظریہ نہیں ہوتا تھا۔ دراصل 'پریمل' ایک نجی قسم کا پلیٹ فارم تھا جہاں کچھ دوست اپنی تصانیف کو پڑھتے پڑھاتے ہی نہیں تھے بلکہ ادبی افکار کو سمجھنے کے لئے مختلف موضوعات پر مقالات لکھواتے یا دوسرے طریقوں سے تفصیلی مذاکرات کرتے تھے۔

معروف ادیبوں و شاعروں کو سننا اور ان سے گفتگو کرنا بھی اس پروگرام کا ایک حصہ تھا۔ ایک بار پتہ چلا کہ سیٹھ گوبند داس الہ آباد آئے ہوئے ہیں اور بہت کم وقت ٹھہریں گے، آناً فاناً ان سے ملاقات کے لئے صبح نو یا دس بجے ''پریمل'' کے جلسے کا انتظام کرلیا گیا۔ اسی طرح، جب نریندر شرما اور اگیئے ایک دو دن کے لئے الہ آباد آئے تو ان کے لئے بھی نشستیں منعقد کی گئیں۔ ویسے تو تقریباً ہر نشست میں کسی نہ کسی معروف ادیب یا شاعر کو مدعو کیا جاتا تھا۔ ایسے مہمانوں کے جو نام مجھے یاد ہیں وہ ہیں: ڈاکٹر امرناتھ جھا، ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی، جناب چھتریش چٹوپادھیائے، جناب رماپرساد گھلڈیال پہاڑی، پنڈت نریندر شرما وغیرہ۔ ایک بار امرت رائے بھی آئے تھے۔ پہاڑی صاحب کے حوالے سے ''پریمل'' میں ایک نیا تجربہ بھی کیا گیا تھا۔ رام چندر ورما نے ''پریمل'' کی ایک نشست کے لئے پہاڑی کی کہانیوں پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا۔ اس نشست میں مہمان خصوصی کے طور پر پہاڑی جی کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور وہ بڑی خوشی کے ساتھ اس میں شریک ہوئے۔ نشست میں پہاڑی پر کھل کر گفتگو ہوئی جس میں ان کی تعریف کے ساتھ ساتھ ان پر تنقید بھی ہوئی۔ پہاڑی نے اس تنقید اور رائے زنی پر اپنا مطمح نظر پیش کیا۔

ڈاکٹر امرناتھ جھا ان دنوں یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ادب سے انھیں خصوصی شغف تھا۔ وہ ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر رہ چکے تھے اور یونیورسٹی اور اس کے باہر کی ادبی سرگرمیوں سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے۔ بہت دنوں تک ''پریمل'' کی نشستوں میں انھیں نہیں بلایا گیا۔ ''پریمل'' کے کئی ارکان اپنی نظموں اور کہانیوں کے لئے خاصی شہرت حاصل کرچکے تھے۔ وہ ڈاکٹر جھا سے کبھی ملے بھی نہیں تھے، لیکن ڈاکٹر جھا ان کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔ مجھے بہت تعجب ہوا جب انھوں نے ایک دن مجھ سے ''پریمل'' کے بارے میں بات کی۔ اس گفتگو کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ ''پریمل'' کی کسی نشست میں انھیں بھی مدعو کرنا چاہیے۔ یہ نشست ۱۹۴۶ کے آخر یا ۱۹۴۷ کے شروع میں ہوئی۔ اس میں دھرم ویر بھارتی نے اپنی کہانی 'پوجا' پڑھی۔ اس نشست کا ذکر میں نے اپنے مضمون 'بھارتی کا تخلیقی سفر' میں کیا ہے۔ اس کا اقتباس نیچے پیش کرتا ہوں:

> پنڈت امرناتھ جھا الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہی نہیں، اپنے آپ میں الہ آباد کا ایک ادارہ تھے۔ وہ عالم اور ادب کی فہم رکھنے والے تھے، ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر رہ چکے تھے۔ ان کے مکان پر شعری نشستیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ انھوں نے جب ''پریمل'' کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ انھیں کسی نشست میں بلایا جائے۔ انھوں نے ہماری درخواست بخوشی قبول فرمائی۔ سوال یہ تھا کہ نشست کا پروگرام کیا رکھا جائے۔ پرکاش چندر گپت اور لکشمی ساگر وارشنے جیسے بزرگ اراکین سے صلاح مشورہ کرکے طے ہوا کہ دھرم ویر سے اپنی ایک کہانی پڑھنے کو کہا جائے۔ ''پریمل'' کی ایک نشست یونیورسٹی کے قریب ہی بھارت بابو (بھارتیندو پرشاد ماتھر) کے گھر پر قائم الہ آباد کافی ہاؤس میں ہوئی۔ ان دنوں میں، جب الہ آباد سیاست اور ادب کا ایک معروف مرکز تھا، بھارت بابو یہاں کے سب سے مقبول صحافی تھے۔ دھرم ویر نے اپنی کہانی 'پوجا' پڑھی: وہی لب و لہجہ جو ان کی پہلی دو کہانیوں میں تھا۔ امرناتھ جھا نے نہایت توجہ اور سکون سے کہانی سنی۔ میں نے اس کے قبل کسی ادبی نشست میں انھیں اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت کی پوری تصویر آج بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اپنے مختصر اختتامی خطبہ میں امرناتھ جھا نے ''پریمل''، ادب، کہانی کا فن اور اس دن کی کہانی پر

www.taemeernews.com

اپنے خیالات بیان کئے۔ 'پوجا' پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انھیں اس کہانی کو دنیا کی عظیم کہانیوں کے مقابل رکھنے میں کوئی تردد نہ ہوگا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہتے؟

ان دنوں مہادیوی جی کسی محفل یا مجلس میں نہیں جاتی تھیں، لیکن اپنے کالج کے پروفیسر ڈاکٹر گنگا پرشاد پانڈے کے ذریعہ انھیں ''پریمل'' کی سرگرمیوں سے پوری واقفیت رہتی تھی۔ ایک بار انھوں نے اپنے ساہتیہ کار سنسد کی عمارت میں ''پریمل'' کی نشست کرنے کی تجویز کی۔ وہ ''پریمل'' کی ایک بہت ہی کامیاب نشست تھی۔

ایسا نہیں ہے کہ ''پریمل'' میں جدید ادب ہی مذاکرہ کے موضوع تھا۔ ڈاکٹر راکیش گپت کا مضمون ادب میں جذبہ اور حسیت کے اظہار کے متعلق تھا۔ فادر کامل بلکے نے ''رام کتھا میں سیتا'' پر مضمون پڑھا تھا۔ ''پریمل'' میں پڑھے گئے سارے مقالے اب پوری طرح یاد نہیں ہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ان کا میدان خاصا وسیع تھا۔ موضوع کوئی بھی ہو، مضمون ادبی ہو، اور ''پریمل'' کا نظریہ ہندی دوستی پر مبنی تھا۔ ''پریمل'' کے اوائلی زمانے میں، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، آل انڈیا ریڈیو سے ہندی کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ مجھے یاد ہے ''پریمل'' کا ایک وفد الٰہ آباد کے اس وقت کے اسٹیشن ڈائرکٹر جناب مدن آغا سے اس سلسلے میں ملا بھی تھا۔ اس کی تصدیق انگریزی اخبار 'لیڈر' کی پرانی فائلوں سے ہوسکتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ جس شخص کو ''پریمل'' کے اراکین، اس کی نشستوں میں پڑھے گئے مقالات اور تخلیقات، اور ان پر بحث مباحثہ کا صحیح علم ہوگا وہ کبھی یہ کہنے کی غلطی نہیں کرسکتا کہ ''پریمل'' ادب کے کسی نظریہ، خیمہ یا کسی ادیب سے بندھا ہوا تھا۔

''پریمل'' کی پہلی نشست کے صدر ڈاکٹر راکیش گپت نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے:

> ان [بشن ٹنڈن] کی پہل پر الٰہ آباد کی مشہور ادبی انجمن ''پریمل'' کا قیام عمل میں آیا۔ اپنے ہم عصروں دھرم ویر بھارتی، جگدیش گپت، گردھر گوپال سریواستو، گوپی کرشن گوپیش وغیرہ کے علاوہ بشن ٹنڈن نے مجھے بھی ''پریمل'' کا موسس رکن بنایا۔ یہ انجمن کسی تنازعہ یا گروہ بندی کے بغیر بہت دنوں تک اعلیٰ ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہی اور اس کے بہت سے اراکین اول درجہ کے فنکار مشہور ہوئے۔

بیشک اراکین کے اپنے ذاتی خیالات ہوتے تھے، لیکن ''پریمل'' ان کا پابند کبھی نہیں تھا۔ کسی دیگر انجمن یا تنظیم سے بھی ''پریمل'' کا کوئی تعلق نہیں رہا، نہ کام کاج کی سطح پر اور نہ ہی کسی قسم کی صفائی کی سطح پر۔ مختلف اوقات میں ''پریمل'' کی فہرست ارکان دیکھنے سے ہی یہ بات صاف ہوجائے گی کہ اس میں ہمیشہ ایسے لوگ شامل کئے گئے جن کے آپسی نظریاتی اختلاف رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بات کہی گئی ہے۔ لیکن ''پریمل'' کا نہ اس سے کوئی مقابلہ تھا اور نہ ہی مخالفت۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ جب تک میں ''پریمل'' کا رکن یا منتظم کار رہا، کسی انجمن یا نظریے کے خلاف کبھی کوئی بات ہمارے کسی جلسے میں کہی گئی ہو۔ اس سلسلہ میں اگئیے کا نام بھی لیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگئیے موقع اور محل دیکھ کر اکثر یہ بات کہتے تھے کہ ''پریمل'' ان کی تنظیم تھی۔ پادھیئے والے معاملے میں تو انھوں نے حد کردی تھی۔ ان دنوں میں ''پریمل'' کا رکن نہیں تھا اور دلی میں تھا۔ پادھیئے جی کا میرا اچھا خاصا تعارف تھا کیونکہ ان کا دفتر دلی میں میرے ماموں صاحب کی کوٹھی کے ایک حصے میں ہی تھا اور وہ رہتے بھی وہیں تھے۔ میں اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ جب پادھیئے جی کو ''پریمل'' سے میری وابستگی کے بارے میں معلوم ہوا تو ہم دونوں میں اس موضوع پر خوب کھل کر بات چیت ہوتی تھی۔ اگئیے جی نے جو کچھ کیا، اس کے بارے میں انھوں نے ہی مجھے بتایا۔ بعد میں گیان پیٹھ کی فائلوں سے بھی مجھے ایسی باتوں کا علم ہوا۔ مجھے بہت کوفت اور شرمندگی ہوئی۔

یہاں اس بارے میں مزید کچھ کہنا مناسب نہ ہوگا، صرف یہ عرض کردوں کہ ۴۶-۱۹۴۵ میں تقریباً دو سال اگئیے الٰہ آباد رہے۔ انھوں نے ''پریمل'' کی رکنیت کے لئے بہت کوشش کی، لیکن وجی اور ہم اس کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئے۔ (بعد میں وجی سے ان کی بڑی دوستی ہوگئی تھی۔) جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، بعد میں ان کے اعزاز میں ''پریمل'' نے ایک نشست بھی منعقد کی تھی جب وہ الٰہ آباد ایک دو دن کے لئے آئے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ''پریمل'' کے اراکین سے ان کے تعلقات بنتے بگڑتے رہتے تھے۔

میں ''پریمل'' کا رکن ۱۹۴۸ تک رہا اور اس سال کے شاید آخر میں میں نے ''پریمل'' چھوڑ دیا۔ اس وقت ڈاکٹر امرناتھ جھا کو ایک بار پھر مہمان خصوصی کے طور پر بلانے کی بات تھی۔ گنگا پرشاد پانڈے نے کچھ اراکین سے کہا کہ وہ اس تجویز کی مخالفت کریں گے کیونکہ یہ سب میں اپنے ذاتی مفاد کے لئے کررہا تھا (ان کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ میں ملازمت کے لئے مقابلے کے امتحانات میں شریک ہونے والا تھا اور ڈاکٹر جھا پبلک سروس کمیشن کے چیئر مین تھے)۔ اپنی موقف کی حمایت حاصل کرنے کے لئے انھوں نے کئی اراکین سے اس قسم کی فضول باتیں کی تھیں۔ مجھے اس ذلیل الزام سے بے حد قلق ہوا۔ گنگا پرشاد پانڈے یہ بھول رہے تھے کہ مجھے ڈاکٹر امرناتھ جھا سے تعلق بنانے یا قائم رکھنے کے لئے ''پریمل'' کی بیساکھی کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے والد محترم سے ان سے بیس سال سے زیادہ پرانے تعلقات تھے اور گذشتہ چار پانچ برسوں سے خود میرا بھی ان سے خاصا تعلق بن چکا تھا۔ وجے دیو اس وقت تک کاشی ودیا پیٹھ جاچکا تھا۔ میں نے بھارتی، گردھر، اور جگدیش سے بات کی اور ان کے پرخلوص اصرار کے باوجود میں نے ''پریمل'' سے استعفیٰ دے دیا۔ میرے بعد گردھر گوپال منتظم کار بنے۔

''پریمل'' چھوڑنے کے بعد بھی اس کے اراکین سے میرے تعلقات پہلے کی طرح رہے۔ اس کے بعد میں نے ''پریمل'' کی صرف ایک نشست میں حصہ لیا۔ یہ ستمبر/اکتوبر 1951 کی بات ہے، میں کچھ دنوں کی رخصت پر الٰہ آباد آیا ہوا تھا۔ واچسپتی پاٹھک کے گھر ایک نشست منعقد کی گئی۔ بھارتی کی فرمائش پر میں اس میں شریک ہوا تھا۔

www.taemeernews.com

''پریمل'' میں نشر واشاعت کے میدان میں کچھ کام ہو، اس معاملے پر سنجیدگی سے کبھی غور نہیں کیا گیا۔ محض یہی خیال رکھا گیا کہ ''پریمل'' کے پروگراموں کو وقتاً فوقتاً شائع کرایا جائے۔ اس کی شروعات بھی ہوئی۔ جن دنوں میں منتظم کار تھا تو ''پریمل'' کے سبھی افسانہ نگار اراکین کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'ہرسنگار' شائع کیا گیا۔ ہاں ۱۹۴۶ اور ۱۹۴۷ کی سالانہ رپورٹ جو میں نے تیار کی تھی اور جو سالانہ نشست (۸ دسمبر) میں پڑھی گئی تھیں، وہ ننڈن پریس کٹرہ میں چھپی تھی۔

لیکن ''پریمل'' الٰہ آباد سے باہر بھی اپنے کام کو پھیلائے، یہ بات شروع سے ہی ہم لوگوں کے ذہن میں تھی۔ اس سلسلہ میں کچھ کوشش بھی کی گئی۔ رام چندر ورمانے پٹنہ میں ''پریمل'' کا کام شروع کیا۔ ''پریمل'' کے اولین منتظم کار رہری موہن سری واستو نے متھرا میں یہی کام کیا۔ ''پریمل'' کے جو ارکان الٰہ آباد سے ترک سکونت کر کے چلے جاتے تھے ان سے ہمیشہ میری یہی گذارش ہوتی تھی کہ اپنی نئی جگہ میں بھی وہ ''پریمل'' کو قائم کریں۔ کچھ دوستوں نے بھی چند شہروں میں ایسی کوششیں کیں، ان کا پورا علم مجھے نہیں ہے لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ''پریمل'' کا کام ہر جگہ بند ہو گیا۔ اس سلسلہ میں راکیش گپت کی خودنوشت سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:

> بشن ٹنڈن مجھے بار بار لکھتے رہتے تھے کہ میں دلی میں ''پریمل'' کو قائم کروں۔ نام تو محض ایک بہانہ تھا، چاہتا تو میں بھی تھا کہ ہندی کے اساتذہ اور ڈگری سطح سے اوپر کے طلبا کا ایک ایسا پلیٹ فارم ہو جہاں سب اکٹھے ہو کر تبادلۂ خیال کریں۔ میں نے جب غیر رسمی طور پر یہ تجویز ہندی کے دیگر اساتذہ کے سامنے رکھی تو سب نے اس کا دلی خیر مقدم کیا۔ پہلی نشست میں نے اپنے کالج میں ہی رکھی۔ شعبہ ہندی اور سنسکرت کے بھی اساتذہ اس میں شریک ہوئے۔ اس سے متعلق کسی موضوع پر میں نے ہی ایک مقالہ پڑھا جس پر تفصیلی مذاکرہ ہوا۔ سامعین کے سوالات کے جواب میں نے دیئے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نشست نہایت کامیاب رہی۔ سب نے اس کی تعریف کی۔ لیکن نہ معلوم کیوں میرے شعبہ کے صدر ڈاکٹر سریندر ناتھ شاستری نے میری اس غیر ضروری تیزی کو پسند نہیں کیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے وہ اپنی ناراضگی کا مختلف طریقوں سے ظاہر کرتے رہے۔ میرا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ دلی میں ''پریمل'' کی وہ پہلی نشست آخری بن کر رہ گئی۔

لگتا ہے کہ ''پریمل'' کے قیام کے پس منظر میں چند مخلص دوستوں کی جس ہم خیالی اور ادب دلچسپی نے عملی شکل اختیار کی تھی، اس کے فقدان میں یہ پودا کسی اور شہر میں سرسبز نہ ہو سکا ☆☆☆

آج کل، نئی دہلی
کارگذار مدیر: ابرار رحمانی

آئندہ، کراچی
مدیر: محمود واجد

ارتقا، کراچی
مدیران: حسن عابد، راحت سعید

اردو چینل، ممبئی
مدیر: قمر صدیقی

استعارہ، نئی دہلی
مدیر: صلاح الدین پرویز

اوراق، لاہور
مدیر، وزیر آغا

بادبان، کراچی
مدیر، ناصر بغدادی

تسطیر، لاہور
مدیر: نصیر احمد ناصر

تشکیل، کراچی
مدیر: احمد ہمیش

جامعہ، نئی دہلی
مدیر: شمیم حنفی

www.taemeernews.com

زندانی کے خواب اور جشن انبوہ

اقبال مجید

میرے سامنے اس وقت علی سردار جعفری کے دو خطوط ہیں جو انھوں نے قید میں ۱۲ اپریل ۱۹۴۹ سے ۱۵ جون ۱۹۵۰ کے درمیان، یعنی ایک سال دو مہینے اور تین دن کی مدت میں اپنی اہلیہ سلطانہ جعفری کے نام لکھے۔ ان خطوط کی تعداد سولہ ہے۔ یہاں ان کے مطالعے کے ذریعہ اس بات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ سردار جعفری کے علمی، ادبی، اور فنی رویے اور ان کی اس وقت کی عمر کے آس پاس کے دور حاضر کے نوجوانوں کے رویے میں کیا بنیادی فرق ہے؟ اور پس نوآبادیاتی دور میں ادیب کی آزادی اظہار کے شور شرابے کے درمیان ہمارے اکثر ہونہار شاعر اور ادیب کیسی تخلیقی غلامی کی بدعت میں گرفتار ہیں۔

اپریل ۱۹۴۹ کے خط میں سردار جعفری رقم طراز ہیں کہ وہ محبت کو پاکیزہ شے مانتے ہیں، وہ انسانیت کی روح اور دل کے زخمی ہونے پر افسردہ ہوتے ہیں۔ وہ اس لئے قید میں ہیں کہ وہ ''انسانیت کے بارے میں سوچتے ہیں۔'' محبت اور انسانیت کے اس موضوع کی وضاحت جس طرح انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین اور شاعری کے ذریعہ کی ہے، اس کا ذکر یہاں مقصود نہیں اور نہ اس جنگ کی موافقت یا مخالفت مقصود ہے جو سردار جعفری نے اپنے نظریہ ادب کی خاطر لڑی۔

قدیم یونانی فلسفہ، یونانی آرٹ اور ادب کی افہام وتفہیم پر انھوں نے اس عمر میں جو وقت صرف کیا اس کا ثبوت اکتوبر ۱۹۴۹ کا یہ خط بھی بن سکتا ہے۔ اس خط میں یونانی آرٹ پر بات کرتے ہوئے وہ اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> یونانی آرٹ میں انسان کے بچپن کی سادگی اور حسن ہے، اس حسن کو اس کے بچپن سے الگ نہیں کیا جاسکتا... آج ہم یونانی آرٹ، یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کے مجسموں، یا یونانی شاعری سے اس لئے لطف اندوز ہوتے ہیں کہ ان میں انسانی شعور کے بچپن کے حسن کا اظہار ہے۔ یہ حسن آج پیدا نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس حسن کو پیدا کرنے کے لئے وہی موضوع ضروری ہے جو یونان کے آرٹ میں ہے۔ اس Content کی بنیاد یہ ہے کہ انسان فطرت کے عمل کو نہیں سمجھتا، اس لئے انسانی خصوصیات عطا کر کے دیوی اور دیوتا بنا دیتا ہے۔ بچے بھی یہی کرتے ہیں وہ اپنی گڑیوں کو کھانا کھلاتے ہیں نہلاتے ہیں اور گڑیوں کی ابتدا اسی دور میں 'جادو' سے ہوئی... آج جادو کی جگہ سائنس نے لے لی ہے... اور اس لئے وہ حسن بھی پیدا نہیں کر سکتے جو یونان کے آرٹ میں ہے۔ جو ہندوستان کے ویدوں اور اجنتا کی تصویروں میں ہے...

اس عمر میں انھوں نے ادب کے موضوعی اور ہیتی مباحث کو لیکر اپنی ایک واضح رائے بھی قائم کر لی تھی۔ وہ اسی خط میں لکھتے ہیں:

> فارم بغیر Content کے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا اور Content بغیر فارم کے ظاہر نہیں ہوسکتا۔ بغیر لفظوں کے ہم سوچ نہیں سکتے اور معنی کے بغیر کوئی لفظ زبان سے ادا نہیں ہوسکتا، پھر وہ جانور کی آواز ہوگا۔ انسان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ نہ ہوگا۔

اس خط کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اپنے عہد کے ادبی افکار و خیالات اور گہرے مباحثوں سے سردار جعفری کو بہت کم عمری میں دلچسپی شروع ہو چکی تھی اور انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ حقیقی ادیب کے لئے افہام تفہیم کا مشغلہ جز وقتی مشغلہ نہیں ہے اور رائے سنی سنائی باتوں سے نہیں بنتی اس کے لئے انتہائی عمیق اور بامعنی مطالعے کی ضرورت ہے۔ اسی لئے ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۹ کے خط میں وہ لکھتے ہیں:

> اب میں کچھ عرصے کے لئے لکھنا بالکل ترک کر دینا چاہتا ہوں اور سارا وقت پڑھنے میں صرف کروں گا۔ معاشی تاریخی اور مادی بنیادیں مضبوط ہونی چاہئیں۔ یہ زمین مضبوط ہو جائے تو پھر ہندوستان کی پرانی تاریخ اور ہندو اور

۱؎ اس مضمون پر انور سجاد کے کئی مضمون ''تخلیقی غلامی اور سیاسی اندیشے'' میں استعمال کی گئی اصطلاحات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

www.taemeernews.com

> اسلامی فلسفہ اٹھاؤں۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر شرم آتی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ اور علوم کے بارے میں میری معلومات کتنی کم ہے۔

آج ایسے کتنے نوجوان شاعر اور افسانہ نگار ہیں جنھیں فلسفہ، تاریخ اور دیگر علوم کی کم معلومات پر نہیں بلکہ مکمل طور پر غیر معلومات پر بھی شرم آتی ہے۔ (مجھے ذاتی طور پر اتنی تو بے شک نہیں آتی جتنی جعفری صاحب کو آتی تھی) اس خط میں ''اردو ادب'' میں باقی کے ایک طویل مضمون پر ان کا ردعمل اس طرح ہے۔

> اس میں سرسید احمد خاں اور حالی کے لٹریچر کے تجزیے میں بڑی فاش غلطیاں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کی تحریک اور ۱۸۵۷ کے غدر کے کردار کو سمجھنے میں غلطیاں ہوئی ہیں۔ پام دت [کذا، اصل: پالمے دت] نے بھی غدر کے کردار کو رجعت پرست بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

اپنی اس رائے پر دلیل وہ یوں دیتے ہیں:

> سو برس پہلے کے اردو ادب کو اس وقت تک سمجھا نہیں جاسکتا جب تک ۱۷۵۷ کی جنگ پلاسی سے لیکر ۱۸۵۷ کے غدر تک کی تمام تحریکوں کا اصلی کردار متعین نہ کیا جائے۔

آج کا بیچارہ نوجوان شاعر یا افسانہ نگار کسی طرح باقی کا وہ مضمون پڑھ بھی لے لیکن پھر اس سے یہ کہا جائے کہ اب جنگ پلاسی سے لیکر غدر تک کی تمام تحریکوں کا اصلی کردار متعین کرو، تو ظاہر ہے وہ بے چارہ یہی کہے گا کہ ایسی مسلمانی اپنے ہی پاس رکھو کہ جہاں روزے بخشوانے جاؤ تو نماز گلے پڑ جائے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۹ کے ایک خط میں آج سے تقریباً پچاس برس پہلے جب کہ ہندوستان میں جدیدیت کا رجحان انگلی پکڑ کر چل رہا تھا، وہ لکھتے ہیں:

> صرف جدیدیت کافی نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی ذہنی دلچسپی بن کر رہ جاتی ہے اور گاڑی کے پٹری سے اتر جانے یا پٹری بدل لینے کا خطرہ ہر وقت رہتا ہے...

یہ مثال دیتے وقت سردار جعفری صاحب کو اس کے دوررس نتائج اور اس مثال میں مضمر امکانات کا شاید پورا اندازہ نہ تھا، کیونکہ اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) ادب کی گاڑی پہلے سے ناپ تول کر بنائی گئی پٹری پر ہی چلتی ہے۔

(۲) اس گاڑی کو وہی انجن کھینچ سکتا ہے جس میں صرف بندھی ٹکی پٹری پر چلتے رہنے کی صلاحیت بہ درجۂ اتم موجود ہو۔

(۳) اگر پٹری یا انجن میں سے کوئی بھی locomotio کے مروجہ سانچوں سے چند ساعتوں کے لئے بھی نافرمانی کرے گا تو گاڑی کا Derailment ہو جائے گا۔

میرے خیال میں سردار جعفری ان بلند پایہ شاعروں میں ہیں جنھیں ادب کو لگاتار ایک ہی پٹری پر ساتھ خیریت کے چلتے دیکھ کر سب سے زیادہ دکھ ہوتا ہوگا۔ پھر بھی سردار جعفری کی بشارت جھوٹی نہیں نکلی، جو ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ خصوصاً اس ''ذہنی دلچسپی'' کے ذریعے پوسٹ کالونیل ازم کے حقیقی میلانات کا استرداد اور نقلی ادبی ضرورتوں کی جو گرم بازاری ہمارے سامنے آئی وہ توجہ طلب ہے۔

پہلی نومبر ۱۹۴۹ کے خط میں سردار جعفری رقم طراز ہیں:

> شمالی اور جنوبی امریکہ دونوں نے مل کر اب تک صرف دو بڑے شاعر پیدا کئے ہیں، انیسویں صدی میں والٹ وٹ مین اور بیسویں صدی میں پبلو نرودا۔ ڈان ویسٹ کی شاعری صرف دلچسپ ہے۔ ابھی اس کا شمار بڑی شاعری میں نہیں ہوسکتا۔

دیگر زبانوں، خصوصاً امریکی، فرانسیسی، روسی، برطانوی، میں کون شاعر بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے اور کیوں؟ نہ صرف ان زبانوں کی شاعری کا مطالعہ، بلکہ اس کی خصوصیات سے گہری واقفیت اس عمر تک پہونچتے پہنچتے سردار جعفری کو بہت حد تک ہو چکی تھی۔ آزاد نظم کے تجربے ہندوستان میں اور خصوصاً اردو میں ان کی جوانی کے ابتدائی دور میں ہی شروع ہوئے تھے۔ اس نئی صنف کے فنی محاسن اور ان کی ضرورتوں کا علم انھیں اچھی طرح ہو چکا تھا اور انھوں نے اپنی آزاد شاعری پر انھیں برتنا شروع کر دیا تھا۔ آزاد شاعری کے فن اور تکنیک کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں:

> آزاد نظم سے قافیہ اور ردیف نکل جاتا ہے، مصرعے بھی نپے تلے اور برابر کے نہیں رہ جاتے، شعر کی جگہ بند لے لیتا ہے۔ اسے نئے آہنگ اور ترنم، نئی تال اور سُر کی ضرورت ہوتی ہے جو قافیے کی جھنکار کا بدل بن سکے۔ بند چونکہ شعر سے بہت زیادہ بڑا ہوتا ہے اس لئے معنوی وسعت اور تخیل کے پھیلاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ معنوی وسعت اور تخیل کے اس پھیلاؤ کو شاعر بہت اچھی اور بھرپور امیجری کے بغیر نہیں سنبھال سکتا ورنہ پورا بند غارت ہو جائے گا۔ اس طرح آزاد نظم کا ہر بند ایک مکمل تصویر ہوتا ہے اور آزاد نظم ان تصویروں کا البم جس کے خط و خال ہر مصرعے کے ساتھ زیادہ واضح ہوتے جاتے ہیں اور آخری مصرع اسے مکمل کر کے Climax پر پہنچا دیتا ہے۔

اس اقتباس کو پیش کرنے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں یہ کہہ سکوں کہ جس نئی شعری صنف کو سردار جعفری نے اپنے شعری تجربات کے اظہار کے لئے انتخاب کیا، اس صنف کی فنی ضرورتوں کو بہت شفاف طور پر اپنے ذہن نشین کرلیا اور یہی نہیں، بلکہ اسے اپنے فن میں برت کر اس مسرت و انبساط کی بھی تونگری بخشی جو ادب کا ایک اہم وصف ہے۔

www.taemeernews.com

قید و بند کے اس عرصے میں انھیں جو کتابیں برائے مطالعہ تمام پابندیوں کے بعد پہنچائی گئیں ان سب کے نام تو معلوم نہیں، مگر ہاں انھوں نے اپنی بیگم سے جن کتابوں کی فرمائش کی یا جن کتابوں اور مشاہیر کے چلتے چلتے حوالے دیئے، ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

کرشن، بیدی، اشک، منٹو اور قاسمی کے افسانے، قاسمی کا شعری مجموعہ "جلال و جمال"، لاہوتی کا فارسی دیوان، دیوان حافظ۔

رسالہ محاذ، میگزین Dialectics

Aeschylus & Athens

پلخناف کی کتاب In Defence of Materialism

ٹالسٹائی کے ناول

شیلی، کیٹس، والٹ وٹ مین، پبلو نرودا، ڈان ویسٹ

والیٹر، روسو

مولانا حالی، سر سید احمد خاں، اور رجنی پالے دت

سردار جعفری نے بار بار اپنی بیوی سے اور دیگر ذرائع سے تازہ بہ تازہ کتابوں کی جو فرمائش کی ہے اس سے ان کے ذوق علم و آگہی اور طلب علم و عرفان کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس مختصر سے خاکے کے بعد جس میں شاعر کی ۳۵۔۳۶ برس کی اصل علمی و ادبی کمائی کی بس ایک رمق ہی دیکھنے کو ملتی ہے، اور وہ بھی بہت سطحی طور پر، میں اصل موضوع کی جانب آتا ہوں۔

ہمارے آج کے ہونہار نوجوان شاعروں اور افسانہ نگاروں کے ایک طبقے کی عمر تقریباً وہی ہیں جو ۱۹۴۹ میں سردار جعفری کی تھی۔ معاشرے نے ذریعہ ان فن کاروں کو جو زخم لگائے ہیں، وہ زخم بھی شاید سردار جعفری کے زخموں سے زیادہ کاری ہیں کہ یہ پوسٹ کالونیل ازم کے کئی معنی میں زیادہ جابر معاشرے کے سفاک پنجوں کے لگائے ہوئے زخم ہیں۔ میں ان نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا علم و ادب کی تلاش اور جستجو کی ان کے دلوں میں وہی تڑپ موجود ہے جو نصف صدی قبل سردار جعفری کے قبیل کے ادیبوں اور شاعروں میں تھی؟ کیا انھیں یقین ہے کہ ادب اور سیاست، فلسفہ اور معاشیات، تاریخ و تمدن، فکشن اور شاعری کے بین الاقوامی منظر نامے پر ان کی وہی نظر ہے کہ جو سردار جعفری اور ان کے ساتھیوں کی رہی ہے؟

ممکن ہے کچھ نوجوان ادیب یہ جواب دیں کہ ہاں، موجودہ سیاق و سباق میں جو مطالعے ان کے لئے اہمیت رکھتے ہیں وہ جاری ہیں۔ ممکن ہے کہ انفرادی سطح پر یہ جواب درست بھی ہو۔ لیکن علم و عرفان کی طلب کی اجتماعی صورت حال جس میں ہمارے ہزاروں ہونہار نوجوان ادیب اور شاعر سانس لے رہے ہیں کیا وہ ادب کے حقیقی کردار کو نبھانے اور علم و آگہی کی بلندیوں تک پہنچنے کے لئے خود کو آزاد دیکھتے ہیں؟ اور کیا اس آزادی کا استعمال تشنگی علم کو بجھانے کے لئے کیا بھی جا رہا ہے؟

ہمارے شاعروں کا ایک اہم طبقہ جو پچھلے ۲۰۔۲۵ برس سے شاعری کر رہا ہے، اس میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسا حلقہ پیدا ہو چکا ہے، جس کا کلام خواہ حقیقی ادب میں جگہ نہ پا سکے، لیکن اسے وہ کلام مشاعروں میں سنانے اور اس کے بل بوتے پانچ ستارہ ہوٹلوں میں ٹھہرنے، ولایتی شرابیں پینے، آرام دہ طیاروں میں سفر کرنے اور سیکڑوں ڈالر کمانے کے مواقع فراہم کر رہا ہے۔ لیکن نہ وہ والٹ وٹ مین کو جانتا ہے اور نہ پبلو نرودا کو۔ وہ نہ والٹیر سے واقف ہے اور نہ روسو سے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سرمایہ کاروں کے بنائے ہوئے صارفین کے اس سماج میں یہ فن کار جانے ان جانے میں انبوہ کے واسطے رائج کئے گئے فن کی منظم صورت حال سے ہاتھ ملا رہے ہیں؟ کیونکہ اب یہ بات آفتاب کی طرح روشن ہے کہ ہمارے عہد میں پیداوار کے سرمایہ دارانہ نظام میں پیداوار اور خواہش، اشیا اور ان کی ضرورت کے درمیان جعلی اور نقلی تعلق پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور حقیقی ضرورتوں کی خصوصیتوں کو پس پشت ڈال کر، خیالی خصوصیتوں کو بنیاد بنا کر، (مثلاً، اس کی قمیص میری قمیص سے زیادہ سفید کیوں ہے؟ کا چکر چلا کر) اپنا بنایا ہوا ڈٹرجنٹ استعمال کرنے کی خواہش کا جھوٹا جال پھیلا کر صارفین میں منافعے کے سماج کی تکمیل کی جا رہی ہے۔ کیا ہمارے یہ ہونہار ادیب یہ نہیں دیکھ رہے کہ سرمایہ کاروں کے بنائے ہوئے اس صارفی معاشرے نے انسان کو انسان سے ہی بیگانہ اور بے تعلق کر رکھا ہے کہ اس معاشرے کا فرد نہ تو اب اپنی یا اپنی وضع کردہ تفریحات یا خوشیوں کا انتخاب کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی حقیقی ضرورتوں کے مطابق اشیا (یعنی فن) کا ہی انتخاب کر سکتا ہے۔

آج ہمارا معاشرہ صارفین کے سماج میں انبوہی فن کے مظاہرے کا پلیٹ فارم بن گیا ہے۔ اس معاشرے کو ذرا اعلیٰ ادب کی شرطوں پر منعقد کرنے کی کوشش کر کے دیکھ لیجئے، آپ بھگا دیئے جائیں گے، کیوں کہ اس طرح کے سارے انبوہی ذرائع ابلاغ پر سرمایہ کاروں کا قبضہ ہے۔ فن کو عامیانہ بنانا ان کی مجبوری ہے۔ اس لئے جب آپ ان پلیٹ فارموں پر جاتے ہیں تو یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کلام حقیقی فن کی پیداوار ہے یا نہیں، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ قابل فروخت ہے یا نہیں۔ اگر اسے قابل فروخت بنانے میں حافظ مزاحمت کرے، لاہوتی رخنہ ڈالے، والٹ وٹ مین راستہ روکے، تو ظاہر ہے کہ آپ انھیں اپنی شاعری کے قریب نہ آنے دیں گے اور سردار جعفری کو دیوانہ قرار دیں گے کہ نے بیسوں برس انھیں سب کے ساتھ جھک ماری۔

ایسی صورت میں آپ کیسی شاعری پیدا کریں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ کے سامنے ایسی شاعری کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ ہوگا جس کا نہ ٹھوس جسم ہوگا اور نہ ٹھوس کردار۔ اور جہاں آپ نے یہ کام کیا، صارفین نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، کیونکہ اس انبوہی فن کا جنم داتا یہی سماج ہے۔ انگلز (Engels) کی اس بات سے اختلاف مشکل ہے کہ بڑا اور حقیقی فن رجحان پسند ہوتا ہے اور یہ رجحان اس کے اندر جذب ہوتے ہیں۔ لیکن صارفین کے ادب کا جب کوئی کردار ہی نہیں تو اس میں کسی رجحان کی تلاش بھی عبث ہے، کیوں کہ رجحان پیدا کرنے والے والٹیر اور روسو وغیرہ کو آپ نے شاعری کو انبوہ میں قابل قبول بنانے کے لئے پہلے ہی نکال پھینکا ہے۔

www.taemeernews.com

ممکن ہے کہ یہ شعرا اور ادیب مجھ پر یہ شک کریں کہ میں ان کی کمائی، ان کی دولت اور شہرت پر جل رہا ہوں اور باتوں باتوں میں ان کو ایسے لوگوں کے ہتھے چڑھا دینا چاہتا ہوں جو انھیں ساختیات اور پس ساختیات کے کولھو میں جوت کر جگادھریوں کے اقلیتی ادب کی سرسوں پیر دائیں گے جس کا تیل تو نظریہ ساز تیلیوں کے تصرف میں چلا جائے گا اور ان بیچاروں کے ہاتھ لگے گی صرف کھلی کی بھوسی۔ یعنی نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ یقیناً صارفین کے معاشرے میں ایسے اکھاڑے بازفن کی جہاں مگدر ہلاتے رہیئے اور پسینہ نکالتے رہیئے بھی سخت ضرورت ہوتی ہے تاکہ فن کار کو حقیقی فن کی جانب دیکھنے کا موقع نہ ملے۔

ابدی فن، اقلیتی فن، مقبول عوام فن اور پاپولر فن وغیرہ کو مارکس وغیرہ کے حوالے سے انور سجاد نے اپنے ایک پرانے مضمون "تخلیق کی غلامی اور سیاسی اندیشے" میں تفصیل سے واضح کیا ہے۔ ان تفصیلات میں جانے کے بجائے میری خواہش تھی کہ آج چھوٹے پردے اور دیگر انبوہی فنون سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کو، جن کی اقلیم میں سنجیدہ اور حقیقی ادب اردلی کی بھی حیثیت نہیں رکھتا اور جو سردار جعفری جیسے شعرا کے ادبی کردار کو بے معنی سمجھتے ہیں، اور جن کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے، انھیں حقیقی ادب کی خصوصیات کا ایک بار پھر احساس دلاؤں۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ اس کے جواب میں ایسے بہت سے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے نام گنوائیں جنھوں نے ان سے پہلے انبوہی فن سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ لیکن انھیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ ہاتھ ملانا ان کی تخلیقی غلامی کا سبب نہ تھا۔ اس تخلیقی غلامی کا جوا صارفین کا سماج پیدا کرنے والا سرمایہ کار نئے ادیبوں اور شاعروں کے کندھوں پر رکھ رہا ہے۔ وہ سارے بڑے ادیب انبوہی فن ہاتھ ملانے سے پہلے ہی اپنی حقیقی ادبی حیثیت کو قائم کر چکے تھے۔

قصہ صرف اتنا ہے کہ جب حقیقی فن کی شناخت سعی رائیگاں ہو جائے، جب عرش سے پرے بلندی پر ایک نئے منظر کی تعمیر کی حسرت مسخرا پن کہلائے، جب دشت امکاں کی سیر کو باولا پن اور اس دشت کی تسخیر اور اسے ایک نقش پا سمیٹ دینے کی تمنا ڈراونا خواب بن جائے اور یہ راز نہ سمجھ میں آئے کہ میر تقی میر نہ تو صارفین کے فن کا نمائندہ ہے اور نہ اقلیتی فن کا، تو پھر وہ اس قدر شور انگیز کیوں ہے کہ سرسوتی جاگ اٹھتی ہے، اور اس حقیقت کو سمجھنے کے دروازے ہی بند کر دیئے جائیں کہ غالب کا دیوان چھونے سے ہمیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ ہم کتاب نہیں بلکہ انسان اور اس کی دیرینہ محرومیوں کو چھو رہے ہیں، پھر ایسی حالت میں اور شہر کو سیلاب کے لے جانے کے غم میں چشم گریہ ناک تھک کے سو جانے کے سوا بھلا اور کیا کرے گی؟

اس لئے ایک بار پھر سنو! بڑا ادب پیاسے انسان اور زخم خوردہ انسانیت کے تازہ بہ تازہ کربلاؤں کی نشاندہی کا نام ہے۔ حقیقی ادب کے بے پایاں خلوص کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ یہ نہ تو حسین کے صبر کا نوحہ ہے اور نہ یزید کے ظلم پر لعنت۔ یہ تو اس صورت حال اور ان انسانی کوتاہیوں پر ماتم کناں ہوتا ہے جو معرکۂ کربلا کو خلق کرتی ہیں اور بس۔ ادیب کے اسے مرثیے میں اس کی رجحان پسندی کے شرارے بالکل اسی طرح پسے ہوتے ہیں جس طرح غذا میں نمک، جو غذا میں دکھائی تو نہ دے مگر ذائقہ اسے ہر نوالے میں محسوس کرے۔ اس تجربے سے ہم کیوں نہ سبق لیں کہ وہی نمک جو غذا میں ذائقے کی روح اور فن میں فن کار کی رجحان پسندی کے شرارے بن جاتا ہے، اگر وہی نمک بار بار ہمارے دانتوں کے نیچے کرچوں کی شکل میں آتا ہے تو اس غذا کو ہم رغبت سے کھا نہیں سکتے بلکہ زہر مار کرتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو اوپر سے نمک چھڑکنے کی عادت ہوتی ہے۔ طبیبوں کی رائے ہے کہ اوپر سے نمک چھڑکنے کی عادت خونی دوران کے نظام میں نقص پیدا کرتی ہے۔ لیکن اتنا ہی نہیں ہے، ادب کے ساتھ اگر یہی رویہ اختیار کیا جائے تو یہ عادت ادب کو بھی بلڈ پریشر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جن ترقی پسندوں اور جن جدیدیوں نے اوپر سے نمک چھڑکا دیکھ لیجئے ان کا ادب آج تک ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا ہے۔ اس لئے یہ ایک بار پھر سمجھ لینا ضروری ہے کہ فن کی منطق کو ایک الگ ہی منطق مانا گیا ہے اور ادیب اسی منطق پر انسان اور انسانیت کی کامرانیوں، محرومیوں اور پسپائیوں کو پرکھتا ہے جن کے آگے خضر بھی بے دست و پا ہے اور الیاس بھی بے دست و پا اور اب یہ ادبی منطق نہ حسین کی منطق ہے اور نہ یزید کی۔ یہ شعور ایک ایسی تیسری دنیا ہے، تیسرا معاشرہ ہے تیسری قدر ہے اور تیسرا نمک ہے جس میں یزید اور حسین کے نمک کو پہچاننے کے لئے بہت دن تک اس دنیا کی، اس معاشرے اور اس عہد کی حلاوتوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ شاعر اور قصہ گو کا طوق پہن کر کہیں تم ان بدقسمتوں میں سے تو نہیں شامل ہو گئے ہو جو صارفین کی نقلی ضرورتوں کی منڈیوں میں سامان ڈھونے والے باربردار ٹٹو کا کام کرتے ہیں، جہاں علم کو نہیں جہالت کو فروغ ہے نقلی مسائل کے نقلی حل کا چلن ہے، جہاں دانشوری کو نہیں عامیانہ پن کو ثبات ہے جہاں مہابھارت کا پریچ Text نہیں، اس کی نشہ آور انبوہی علامتیں بکتی ہیں۔ سلام مچھلی شہری نے بھی سردار جعفری کی طرح خوابوں پر مکالمہ کیا ہے۔ انھوں نے جب یہ شعر کہا تو ممکن ہے کہ پہلا مصرع انھوں نے جعفری سے مخاطب ہو کر کہا ہو لیکن دوسرے مصرع میں وہ تم سے مخاطب ہے۔ شعر یوں ہے:

خواب اور حقیقت میں جب بھی چھیڑ ہوتی ہے خواب ہار جاتا ہے
اور یہ بھی ہوتا ہے تلخ حقائق میں خواب یاد آتے ہیں

پوسٹ کالونیل ازم کے سرمایہ کاروں کی طرح گرد ہی ادب کے نظریہ سازوں کے ہاتھوں ادب میں نقلی موضوعات کی نقلی ضرورت پیدا کر کے ذہنی دلچسپی کی نقلی اشیا یعنی نقلی فنون، پیدا کرنے کی منظم کوشش کی خبر تو تم تک پہنچ گئی ہوگی۔ کیا ان تلخ حقائق کے باوجود تمھیں کوئی خواب یاد نہیں آتا؟ وہ خواب، جو تمھارا اپنا ہے، کسی سے ادھار لیا ہوا نہیں، سردار جعفری سے بھی نہیں، بلکہ تمھاری اپنی جاگتی آنکھوں کا خواب جو نظریے نہیں بلکہ ادب کی گود میں پلے، جو تمھیں باربردار ٹٹو کے بجائے شاعر اور ادیب بنا سکے اور تمھیں وہ آزادی دلا سکے جو دی نہیں جاتی بلکہ چھینی جاتی ہے بشرطیکہ تمھیں بہر حال وہی آزادی درکار ہو ☆☆☆

www.taemeernews.com

دو چار قدم

مقصود الہٰی شیخ

گھر سے نکلنے سے قبل اس نے موسم کا اندازہ کر کے ہی کپڑے پہنے تھے۔ لیکن سڑک پر پہنچتے پہنچتے اسے گرمی محسوس ہونے لگی۔ اس نے ڈک ورتھ روڈ (Duckworth Road) اور الرٹن روڈ (Allerton Road) کے سنگم پر بنے ہوئے منی راؤنڈ اباؤٹ (Mini roundabout) سے دو قدم آگے روڈز وے (Rhode's Way) پر مڑتی سڑک پر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے سوچا کہ سڑک پار کر ہی لے۔ لیکن ایک دم اچانک دائیں جانب سے ایک، پھر دوسری اور پھر تیسری کار نمودار ہوئی اور تیزی سے اسے پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے چڑھائی کی طرف چلی گئی۔

اس نے سوچا یہ اسپاٹ (spot) ہمیشہ سے بڑا ڈاجی (dodgey) رہا ہے۔ راؤنڈ اباؤٹ بننے کے بعد بھی کئی حادثے ہو چکے ہیں۔ یہاں اشارہ لگنا چاہئے۔ وہ حال ہی میں پاکستان ہو کر آیا تھا جہاں لوگ ٹریفک لائٹ کو اشارہ کہتے ہیں۔ پاکستان میں وہ اپنے ایک بہت پرانے ساتھی سے ملنے ٹیکسی میں جا رہا تھا۔ وہ علاقے سے واقف تھا۔ لیکن گھر کا پتہ اس کے پاس نہ تھا، یہ ضرور معلوم تھا کہ اس کا دوست اب بڑا مشہور وکیل ہے۔ چنانچہ ایک جگہ رک کر راستہ پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ مطلوبہ جگہ اشارے کے پاس ہے۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا، ''دور تک کوئی بڑا اشارہ یا نشان نظر نہیں آ رہا۔'' ڈرائیور نے اسے سمجھایا تھا، ''جناب، اشارہ ٹریفک لائٹس کو کہتے ہیں۔'' اسے ٹریفک لائٹس کا یہ ترجمہ اچھا لگا تھا، لہٰذا وہ لفظ اس کے ذہن میں بیٹھ گیا تھا۔

گرمی کی تپش سے دماغ بے چین ہو رہا تھا۔ تپش سے کچھ چھٹکارا پانے کے لئے اس نے پہلے ٹوپی اتار کر جیب میں اڑسی، پھر ٹاپ کوٹ اتار کر بازو پر ڈال لیا۔ جب وہ دوبارہ سڑک پار کرنے لگا تو شائیں شائیں کرتی ہوئی کاروں کی قطار بائیں طرف سے گذرتی ہوئی نکلنے لگی۔ اس نے دل کو تسلی دی، ایسی بھی کیا عجلت ہے۔ ادھر ٹوپی اور کوٹ اتارنے سے طبیعت کو کسی قدر سکون محسوس ہوا۔ اسے ایک اور ''لسانیاتی لطیفہ'' یاد آ گیا۔ اس نے پاکستان میں مقیم اپنے نواسے سے کہا، ''جاؤ غسل خانے سے میری عینک اٹھا لاؤ۔'' بچہ تھوڑی دیر بعد خالی ہاتھ آ گیا۔ غسل خانے میں جہاں اس کی عینک پڑی تھی، وہ مقام اس نے بچے کے ذہن نشین کرایا۔ بچہ پھر بھی خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ اس نے پوچھا، ''عینک ملی؟'' بچے نے جواب دیا، ''ابھی تو مجھے غسل خانہ ہی نہیں ملا۔''

''وہ سامنے کیا ہے؟''

بچے نے کہا ''ہم اسے باتھ روم کہتے ہیں۔''

ہلکی ہوا کے جھونکے کے لمس کے ساتھ ہی، پشت پر درختوں کے جھنڈ سے چڑیوں کی ملی جلی آوازوں نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ ان آوازوں میں فاختہ کی ''کو...ہو'' بڑی نمایاں تھی۔ تازہ ہوا کا جھونکا بدن کو نہال کر گیا اور پرندوں کی آوازیں کانوں میں رس گھول گئیں۔ اس نے سڑک پار کرنے کا نئے سرے سے ارادہ کیا تو اچانک اس کی نگاہ بیچ سڑک کسی چمکتی شے سے جا ٹکرائی۔ دو قدم پر تین سکے پڑے چمک رہے تھے۔ سڑک پار کرنے اور سکے اٹھانے کی نیت سے آگے بڑھنے لگا تو دائیں بائیں دونوں طرف کا ٹریفک نئے سرے سے رواں ہو کر رکاوٹ بن گیا۔ وہ سہم کر جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

''کچھ نہیں، عمر ڈھل رہی ہے۔ ناتوانی نے مجھے بزدل بنا دیا ہے،'' اس نے سوچا۔ بالفرض اگر میں ٹریفک کا شور نہ سن پاتا تو بے دھیانی میں آگے بڑھنے پر حادثے کا بھی شکار ہو سکتا تھا؟ وہاں زیادہ سے زیادہ پانچ، دس یا بیس پنس کے یہی دو تین سکے پڑے ہوں گے۔ یقیناً اتنی چھوٹی سی رقم کے لئے کسی قسم کا جوکھم مول لینا دانشمندی نہیں حماقت ہو گی۔ سکوں کو چھوڑو، سڑک پار کرو میاں جی!

وہ حیران ہو رہا تھا، خواہ مخواہ ہر قسم کا خوف دل کے اندر گھستا چلا آ رہا ہے۔ میں بے سوچے سمجھے اپنی جان جوکھم میں نہیں ڈالوں گا۔ اسے کوئی جلدی نہ تھی۔ صحیح وقت پر ہی سڑک پار کر کے، نیوز ایجنٹ سے اخبار لے لے گا۔ ساتھ ہی گھر پر اخبار دوبارہ سے پہنچانے کے لئے کہہ آئے گا۔ ہفتہ بھر کے لئے اسکاٹ لینڈ جاتے ہوئے وہ اخبار بند کرا گیا تھا۔ اب واپس آ کر وہ خبروں اور اپنے پسندیدہ کالموں

www.taemeernews.com

کے لئے پیاسا تھا۔ ادھر ٹی۔وی۔ بھی دغا دے گیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں کرائے کی عدم ادائیگی کی بنا پر کئی چینل بند ہو گئے تھے، چنانچہ خبروں کی دید شنید محدود ہو چکی تھی۔ وہ جب تک آزاد چینل کی تازہ ترین خبریں نہ دیکھ لے اسے چین نہیں آتا۔ خبریں... خبریں... کبھی کبھی وہ خود پر ہنستا کہ میں کسی قابل نہیں مگر عالمی حالات پر ہر دم نظر رکھنے کا متمنی ضرور ہوں۔

وہ چوکنا ہو کر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ سوچ کا دھارا اسی رفتار میں تھا۔ اس نے آزاد چینل بحال کرا لئے ہوتے مگر کمبخت یادداشت کی خرابی کی بنا پر وہ اپنا پلاسٹک کارڈوں والا پرس گلاسگو(Glasgow) میں بیٹے کے ہاں بھول آیا تھا۔ بیچ میں سنیچر اور اتوار آ گیا۔ اب پیر کو ہی میرا پرس سپرد ڈاک کیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی اسکائی(Sky) والوں کی ادائیگی ہوگی، پھر ویو(view) بحال ہوگا۔ اس لئے اخبار خریدنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔

سڑک پار کر کے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے یہ اچھا کیا کہ قریب سے گذرتے ہوئے بھی وہ سکے نہ اٹھائے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یقیناً اسپاٹ(spot) پر پلک جھپکنے میں پہنچ جانے والے ٹریفک کی زد میں آ سکتا تھا۔ اگر جی نہ مانا اور سکوں کو اٹھانے کی نیت قائم رہی تو واپسی پر سہی! اس نے فی الحال دماغ کو ٹھکانے سے لگا کر، خواہ مخواہ کی سوچ سے نجات حاصل کی۔

مگر اس خیال سے نکلا تو ماضی میں جا ڈوبا۔

وہ جن دنوں بے کار تھا، یعنی جب اس کے پاس کار نہیں تھی، وہ شہر سے گھر، اور گھر سے کسی بھی جگہ کا دو تین میل کا فاصلہ ہمیشہ پیدل ہی طے کیا کرتا تھا۔ بس کے سفر کے لئے بھی گھر سے اسٹاپ تک تو چلنا ہی پڑتا تھا۔ اس پدیاترا میں کئی مرتبہ اسے سڑک پر پڑے ہوئے سکے ملتے جنھیں وہ اٹھا لیتا اور جمع کرتا رہتا۔ جب تھوڑی بہت رقم اکٹھی ہو جاتی تو وہ کسی نہ کسی چیریٹی(charity) کو بھیج دیتا۔ ایک بار مطیع الرحمٰن اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے تعجب کیا کہ وہ سامنے ہی نہیں، پیچھے زمین پر دیکھتا ہوا چلتا ہے! کمال ہے، دھول میں پڑے مٹی میں اٹے گمشدہ سکے اسے نظر آ جاتے ہیں۔

مطیع پڑوس میں انگریزوں کے دو گھر چھوڑ کر رہتا تھا۔ نمازی پرہیزگار تھا، مکے مدینے کی متبرک تسبیح ساتھ رکھتا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر چپکے چپکے دانے پھیرا کرتا تھا۔ اسے عبادت کی دکھاوٹ سے چڑ تھی۔ دوستی اور اپنے زہد کی بنا پر، مطیع اسے بھی عبادت کرنے اور نیک بننے کی نصیحت کرتا رہتا تھا۔ جب اس نے مطیع کے سامنے سکے اٹھائے تو مطیع نے بے ساختہ اور بے تکلف پوچھا، "یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے سادگی سے بتا دیا کہ وہ گرے پڑے سکے اٹھا کر نیوز ایجنٹ یا کسی بھی دکان کے کاؤنٹر پر رکھے فلاحی ڈبے میں ڈال دیتا ہے۔ اگر ایسا موقع نہ ملے تو وہ انھیں جمع کر کے بچوں کے کسی خیراتی ادارے میں بھیج دیتا ہے۔ مطیع اس کی بات سے مطمئن اور قائل نہ ہوا، الٹا سمجھانے لگا۔

"تمھیں شاید معلوم ہے یا نہیں، یہ قانون کے خلاف ہے... اگر تم پڑے گرے سکے اٹھاتے ہی ہو تو جا کر پولیس اسٹیشن میں جمع کرایا کرو۔"

اس نے جواب دیا تھا۔ "بھلا کوئی چند سکوں کے لئے یہ کشٹ اٹھائے گا؟" پولیس اسٹیشن جانا اور قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری آنے پر معمولی سکے کاؤنٹر پر رکھ کر نیم خنداں سپاہیوں کی نظروں میں احمق تصور کیا جانا اسے ہرگز گوارا نہ تھا۔ کوئی بھی ترغیب اسے اس مشق پر آمادہ نہ کر سکتی تھی۔ اس جواب سے غیر مطمئن ہو کر مطیع نے کہا تھا کہ مقررہ مدت کے اندر اگر ان سکوں کا کوئی دعوے دار نہ آیا تو تم ہی اس رقم کے حقدار بن جاؤ گے۔

وہ لالچی نہ تھا، نہ کسی حقیر سی رقم کا حصول اس کے دھیان میں تھا۔ اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا تھا۔

"یہ تو رادھا کے رقص کے لئے نو من تیل جمع کرنے والی بات ہوئی۔"

اس نے اپنے دوست کی نصیحت ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دی۔ اسے اطمینان تھا کہ یہ کوئی برائی نہیں ہے۔ بڑی رقم، مدتوں کا مدفون، گمشدہ یا خفیہ خزانہ کبھی ملا نہیں کہ وہ پولیس کو بیچ میں لاتا۔ پولیس کو بیچ میں لانا ایسی بیوقوفی ہے جس کے لئے اس کے پاس وقت نہیں ہے۔

دن پھرنے اور خوشحالی آنے پر اس نے کار خرید لی تھی۔ کار کے استعمال نے اسے سڑک پر گرے پڑے سکے اٹھا کر جمع کرنے اور چیریٹی میں بھیجنے کے جھنجھٹ سے چھٹکارا دلا دیا اور یہ قصہ پرانا ہو گیا۔

ایک مدت بعد اسے اتنا پرانا یہ سب کچھ کیوں یاد آ رہا تھا؟ دھوپ سے اس کا بدن پسیجنے لگا تھا اور بازو پر پڑا ہوا ٹاپ کوٹ انتہائی غیر ضروری بوجھ بن کر ستا رہا تھا۔ مگر نیوز ایجنٹ کے یہاں سے اخبار، ڈبل روٹی، پولو اور چیز اینڈ انین پائی (cheese and onion pie) خرید کر وہ نکلا تو آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ دھوپ رخصت ہو رہی تھی اور ہوا میں بڑی خوشگوار سی خنکی تھی۔ اس عمر میں (وہ لفظ "بڑھاپا" کے استعمال سے ہمیشہ گریز کرتا) پل میں سردی اور پل میں گرمی لگنے لگتی ہے۔ اس نے دل کو تسلی دی کہ اچھا ہوا میں کوٹ لے آیا تھا۔ بالفرض زیادہ ٹھنڈی ہوا چلتی یا پھوار پڑنے لگتی تو بھیگتے ہی چھینکوں سے ناک میں دم ہو جائے گا اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ایک بار باہر نکلنے کا خمیازہ کئی دنوں تک کھانستے، چھینکتے اور بستر پر کروٹیں بدلتے گذارنا پڑتا۔ موسم کا کیا اعتبار؟ یہاں بندہ بندے پر بھروسا نہیں کرتا۔

وہ پھر سڑک پار کرنے کے مخمصے سے دوچار ہونے جا رہا تھا مگر اس کا ذہن لمحاتی طور پر ماضی میں چلا گیا۔ پرانے ایام عود کر آئے۔ اس نے بظاہر مطیع کی بات نہ مانی تھی لیکن اس کی مذہبیت سے مرعوب ضرور تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر شہر کی بڑی مسجد کے مولانا صاحب سے اس نے ایک بار پوچھا تھا:

"حضرت، سڑک پر پڑے سکوں کا اٹھانا از روئے شرع کیسا ہے؟"

مولانا نے فرمایا تھا، "نہیں اٹھانے چاہئیں۔"

"لیکن اس میں حرج کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

مولانا نے کہا:

"جس کی کوئی چیز گری ہو اسے وہیں پڑی رہنے دینے میں مصلحت یہ

www.taemeernews.com

ہے کہ اس شے کا مالک اسے ڈھونڈتا ہوا آئے تو گم شدہ شے اسے مل جائے گی۔ لیکن کوئی دوسرا اٹھالے گا تو مالک محروم رہے گا۔"

وہ مطمئن نہ ہوا۔ "مگر مولانا، اصل مالک کے دوبارہ آنے تک کیا ضروری ہے کہ سکہ وہاں پڑا ہی رہے؟ کسی گمراہ شخص یا شرارتی لڑکے کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس سے نشہ آور "گم" یا "پڑیا" وغیرہ بھی خرید سکتا ہے۔"

اس پر مولانا نے فرمایا:

"اس صورت میں پیسے کو اٹھا کر خیرات کر دینا مناسب ہے۔ پانے والے کو یہ سکے کسی حالت میں اپنے پاس رکھنے کا حق نہیں ہے۔"

پھر حالات بدل گئے۔ کار کے استعمال کے ساتھ ہی اس کے شب و روز میں تبدیلی آ گئی۔ باہر اور گھر کی آمد و رفت کے اوقات بالکل بدل گئے۔ پیدل چلنے کا اتفاق کم سے کم ہو گیا۔ سڑک پر گرے پڑے سکے ملنے پر جمع کر کے بچوں کی کسی فلاحی چیرٹی میں بھیجنے کے بجائے اس نے اپنے بینک کو مستقل ہدایت دے دی کہ اس کے کھاتے سے مقررہ تاریخ پر فلاں فلاں فلاحی ادارے کو مخصوص رقم ارسال کر دی جائے۔

اس کے ذہن میں یاد کی کئی کرنیں اگ آئی تھیں۔ ایک مرتبہ وہ گھر سے نکلا تو مطیع آگے آگے جا رہا تھا۔ وہ اسے آواز دینے ہی والا تھا مگر کسی انجانے خیال کے تحت چپکا پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ نکڑ پر مطیع ایک جگہ رکا اور اس نے کوئی چیز اٹھائی اور ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔ اب اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی دائیں جیب میں تسبیح پھیر رہا تھا اور دوسرا ہاتھ بائیں جیب میں تھا۔ زمین پر پڑا ہوا وہ سکہ یا کوئی اور شے اٹھا کر جیب میں رکھنے اور چل پڑنے میں ذرا سا توقف تھا۔ مطیع نے نہایت عجلت سے ادھر ادھر دیکھا تھا (شکر ہے پلٹ کر نہیں دیکھا ورنہ اس کی وجہ سے شرمندہ ہوتا)، **پھر فوراً ہی تیز تیز قدم اٹھاتا آگے چل دیا تھا۔ مطیع تو اسے پڑے گرے سکے اٹھانے کو منع کرتا تھا۔ اب ایسی کون سی اشرفی مل گئی کہ ڈگمگا گیا اور جھٹ اٹھا کر جیب میں** اسے جیب میں ڈال لیا؟

پل دو پل بعد وہ مسکرایا۔ ہم برف پر چلتے ہوئے پھسل کر گر پڑتے ہیں لیکن پھرتی سے اٹھ کر جھینپ مٹانے کے لئے ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ یہ بڑا میکانکی عمل ہوتا ہے۔ چوٹ سے زیادہ یہ فکر ہوتی ہے کہ ہم پر کوئی ہنس تو نہیں رہا؟ ابھی ابھی اس نے بالکل ویسا ہی منظر دیکھا تھا۔ سب انسان ایک سے ہیں کوئی شخص بے عیب نہیں۔ کوئی فرد، ایک بھی بشر شاید ان چھوٹی چھوٹی کمزوریوں، کمینگیوں سے مبرا نہیں۔ دوسروں کو نصیحت کرنا اور خود برعکس عمل کرنا عام دستور ہے۔ مطیع نے جس عجلت سے سکے اٹھا کر جیب میں ڈالے تھے اور پھر ادھر ادھر نظر گھمائی تھی... مطیع کے انداز دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اس لمحے کو یاد کر کے وہ اس وقت بھی مسکرا رہا تھا۔

سڑک پر ٹریفک کم ہو چکا تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور مطمئن ہو کر سڑک عبور کرنے کے لئے دو چار قدم ہی بڑھائے تھے کہ اچانک ایک دودھ گاڑی آئی اور اسے چھو گئی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ دودھ والا نہایت پھرتی سے گاڑی سے اتر کر اس کی طرف آیا اور اس نے اسی پھرتی سے اسے سنبھال لیا۔ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ دودھ والے کو تسلی ہو گئی کہ "کسی" کا کچھ نہیں بگڑا۔ اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"معاف کیجیے گا، مجھ پر احتیاط لازم تھی۔ آپ کو چوٹ لگ سکتی تھی۔ ادھر پوری سڑک پر زیبرا کراسنگ بھی تو نہیں ہے۔" پھر اس نے نرم نرم دوستانہ لہجے میں کہا۔

"اپنا خیال رکھا کریں (Take care)" اور سڑک پر پڑے ہوئے سکے اٹھا کر جھٹ اپنے راؤنڈ پر چلا گیا ☆☆☆

برصغیر کے مایۂ ناز نقاد، شاعر، افسانہ نگار، لغت نویس، مترجم، دانشور

شمس الرحمٰن فاروقی

کے ادبی کارناموں اور شخصیت پر

اردو چینل

کا

خاص نمبر

بہت جلد شائع ہوگا

مدیر

قمر صدیقی

اردو چینل

7/3121, Gajanan Colony,
Govandi,
Mumbai-400043

www.taemeernews.com

تیــن دن کـے بــعــد

آنند لہر

صبح نمودار ہوئی۔ لیکن سورج نکلنے سے پہلے وہ جاگ چکا تھا۔ لگتا تھا کہ ہر صبح وہ سورج کا انتظار کرتا ہے۔

یعنی کہ روشنی کا انتظار، اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے بدلے میں سورج اس کے چہرے کو چومنا چاہتا ہے۔ اس کے چلن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں پیار کا بدلہ پیار ہے۔

لوگ آ چکے تھے۔ کیونکہ ہر صبح وہ یہاں آتے ہی انھیں کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ پھر وہ پھل جو اس نے اکٹھے کئے ہوتے تھے، انھیں کھلایا کرتا تھا۔ لوگ روزمرہ کے مسئلوں پر اس سے تبادلہ خیال کرتے۔ لیکن سب سے پہلے وہ اپنے کھیتوں پر کام کرتا تھا، جانوروں سے پیار کرتا تھا۔ ان کے لئے پینے کے لئے پانی کا انتظام کرتا تھا۔ ان کے گھروں کو صاف کرتا تھا اور پھر کنویں سے پانی نکال کر اپنے پینے کے لئے جمع کرتا تھا۔

آج یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ آیا ضرور، مگر اس نے آتے ہی ایک سوال کر دیا کہ اگر وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ تین دن کے بعد مر جائیں گے تو کیا کریں گے؟

سب اس سوال کو سن کر چونک گئے، اگرچہ بچوں اور جانوروں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لوگوں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کیا یہ وہی آدمی ہے جو یہاں آتے ہی بچوں سے کھیلا کرتا تھا، جوان ہوتے ہوئے لڑکوں سے مذاق کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ لڑکیوں کے بارے میں ان سے وہ یہ بھی پوچھ بیٹھتا: ''کسے پسند کرو گے تم؟'' اور پھر جب لڑکیاں آتیں تو ان سے بھی اسی طریقے سے بے تکلف ہوتا۔ لگتا تھا کہ تکلف کی حدود کو اس نے پار کر لیا ہے اور دوستی کی جنگ جیت چکا ہے۔ اس لئے کوئی اس کی باتوں پر کسی طرح کا اعتراض نہ کرتا تھا۔ سب اس سے مشورہ کرتے تھے، گھر بنانے کا مشورہ، بچوں کو پڑھانے کا مشورہ، شادی بیاہ کا مشورہ، اور گیان تیاگ کی باتوں کا مشورہ۔ ایک بار تو اس کے بارے میں یہاں تک مشہور ہوا کہ وہ سونا بنانا بھی جانتا ہے۔ ایک اسکول ماسٹر کو راتوں رات امیر بننے کا شوق ہوا وہ اس کے پیچھے پڑ گیا کہ مجھے سونا بنانے کا طریقہ بتاؤ۔

اسے معلوم تھا کہ ماسٹر صبح دیر سے اٹھتا ہے اور نہائے بغیر ہی اسکول جاتا ہے، بچوں کو پڑھاتا نہیں ہے اور بیوی کو بھی چھوڑنا چاہتا ہے۔

اس نے اس سے کہا کہ وہ صبح سویرے اٹھ کر آئے تو وہ اسے بتا دے گا۔

ماسٹر صبح سویرے اٹھ کر اس کے پاس آیا، پھر اس کے کہنے پر لگاتار آنے لگا۔ مگر اس نے سونا بنانے کا طریقہ اسے نہ بتایا۔

پھر ایک دن اس نے کہا کہ نہا کر آیا کرو، پھر سونا بنانے کا طریقہ بتاؤں گا۔ اس پر ماسٹر نہا کر آنے لگا۔ کچھ دن میں ماسٹر کو نہانے کی عادت ہو گئی مگر پھر بھی اس نے اسے سونا بنانے کا طریقہ نہ بتایا۔ پھر اس نے کہا کہ اسکول میں بچوں کو دل لگا کر پڑھانا شروع کرو تو سکھاؤں گا۔ ماسٹر نے ایسا ہی کیا۔ اب وہ صبح اٹھتا، خوب نہاتا اور اس کے بعد بچوں کو سکول میں دل و جان سے پڑھاتا۔ ہوتے ہوتے بیوی کے ساتھ اس کے تعلقات خود بخود اچھے ہو گئے۔ ایک دن اس نے ماسٹر سے پوچھا، ''تمھیں سونا بنانے کا طریقہ بتاؤں؟'' تو ماسٹر نے صاف کہہ دیا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔

''کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس لئے کہ اب میں خود ہی سونا ہو گیا ہوں۔'' ماسٹر نے چونکا دینے والی بات کی۔ مگر آج اس نے آتے ہی ایک نیا سوال کر دیا تھا۔ اگر تمھیں معلوم ہو جائے کہ تم تین دن کے بعد مرنے والے ہو تو تم کیا کرو گے؟ وہ یہ سوال ایک ایک کر کے پوچھنے لگا۔ لوگوں کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا کہ کوئی ایسا سوال بھی کر سکتا ہے۔

''بینکوں میں میرا بڑا روپیہ ہے جس کا صرف مجھے پتہ ہے۔ روپیہ نکال لوں گا اور اپنے بیٹوں میں بانٹ دوں گا۔''

''مگر تین دن میں ایسا نہ کر سکو تو کیا کرو گے؟'' اس نے اپنا سوال دہرایا۔

''بھگوان سے دعا کروں گا کہ کچھ زندگی کے دن اور دے تاکہ میں اپنا کام کر سکوں''۔

دوسرے نے اس سوال کا جواب یوں دیا:

''میں نے بہت سے لوگوں سے روپیہ لینا ہے ان سے جلدی جلدی لے لوں گا اور پھر بچوں میں بانٹوں گا۔''

''اگر ایسا نہ کر سکے تو پھر کیا کرو گے؟'' اس نے اپنا سوال پھر پوچھا۔ دوسرے کا جواب بھی پہلے ہی کی طرح تھا۔ تیسرے کا جواب یوں تھا:

''جو پہلے نہیں کھایا وہ کھاؤں گا۔ خوب مزالوں گا اچھے پکوان بناؤں گا۔''

''اور ایسا نہ کر سکے تو کیا کرو گے؟''

تیسرے کا جواب بھی وہی تھا۔ لوگ پریشانی کے عالم میں اٹھے اور چلے گئے۔

لیکن وہ اپنے نظام الوقت کے مطابق اٹھا اور اندر چلا گیا۔ دوسرے دن صبح اس نے حسب معمول سارے کام کئے۔ کھیتوں میں پانی دیا، گائے کو چارہ کھلایا۔ لوگ پھر اکٹھے ہوئے۔ مگر اس کا سوال پھر وہی تھا۔ اور اب تین دن کے بجائے بات

www.taemeernews.com

دو دن کی تھی۔ بستی کے تمام لوگ گھبرا گئے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ کوئی پوجا پاٹھ میں مصروف ہو گیا، کوئی اپنے بیٹے کی شادی دیکھنے میں اور کوئی اپنی بیٹی کی شادی میں۔ کوئی پیسے اکٹھے کرنے لگا تو کوئی پیسے بانٹنے لگا۔ ایک عجیب و غریب ماحول پیدا ہو گیا۔

ہر شخص کو لگا کہ ہم میں سے ہر شخص تین دن کے اندر مر جائے گا۔ لوگ اس فکر میں سرگرداں رہے اور اپنے گھروں سے بے دل ہو گئے۔ جانوروں نے ان کے گھروں میں پناہ لے لی حالانکہ وہ کئی یگوں سے جانوروں کو گھروں سے باہر نکالنے میں مصروف رہے تھے۔ بڑے بڑے خوفناک جانور جن کا تصور آتے ہی انسان گھبرا جاتے، اب مزے سے بستی میں گھومنے لگے اور دھوپ ان کے گھروں کے اندر رہنے لگی۔

اب انھیں کسی بات کا فکر نہ تھا۔ انھیں یقین آ گیا تھا کہ رشتے ناطے فضول ہیں، کاندھوں پر لادا گیا غیر ضروری بوجھ ہیں۔ انھیں اپنی لڑکیوں کی حفاظت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انھیں معلوم ہو گیا کہ یہ بڑے مکان دھوپ کو روکتے رہے ہیں اور ہوا سے انھوں نے دشمنی تب مول لے لی تھی جب ایک دوسرے کی سانسوں سے انھوں نے نفرت شروع کی تھی۔ آنکھوں نے وہ دیکھا ہی نہیں جس سے ان کی روشنی تیز ہو سکتی تھی۔ مضبوط رشتے ریت کے پہاڑ نظر آنے لگے تھے اور ہر ایک نے یقین کیا کہ اس کا اپنا بدن ہی سب سے خوبصورت تھا۔

تین دن کے بعد وہ مر سکتے ہیں۔ اس ڈر کے دباؤ سے لوگ عجیب و غریب کام کر رہے تھے۔ یوں تو وہ جانتے ہی تھے کہ ہم کسی بھی وقت مر سکتے ہیں مگر یہ تین دن والی بات ان پر بجلی کی طرح گری۔

آخری دن اس نے سوال کو پھر دہرایا۔ لوگ پسینے سے شرابور ہونا شروع ہو گئے۔ زندگی کے تمام گناہوں کے بارے میں سوچتے رہے۔ انھوں نے سوچا کہ چاندنی بہار موسم ہوا پانی سب بے کار ہیں۔ ان کی خاطر ہر چیز انھیں جان سے مارنا چاہتی ہے۔

مگر وہ بوڑھا آرام سے جی رہا تھا اس کے دل پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ تھا۔ اور یہ سلسلہ چلتا ہی گیا۔ تین دن کے بعد دو دن اور پھر ایک دن، مگر ہر دن اس کے لئے برابر تھا۔ لوگوں کا ایک ایک پل مشکل سے گذر رہا تھا وہ بہت گھبرا رہے تھے۔ وہ اپنے بچوں سے پیار کرنا بھی بھول گئے تھے مگر اس بوڑھے پر، بچوں پر اور جانوروں پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔

لوگ اسے اپنے دکھوں کا مداوا سمجھتے تھے مگر وہ اپنے آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ لوگ اپنے ہونے والے کام کو اس سے منسوب کرتے مگر اس نے کبھی نہ کہا تھا کہ تم لوگ ایسا کرو۔ لوگ اسے ہر چیز دینے کو تیار تھے مگر وہ ان سے کچھ بھی لینے کو تیار نہ تھا۔

تیسرے دن کے آخری لمحوں میں تراہ تراہ مچ گئی۔ کھیت خالی تھے اور بازار سنسان۔ انسان کا یہ حال دیکھ کر جانور بھی پریشان ہو گئے تھے۔

تین دن پورے ہوئے۔ جب چوتھی صبح ہوئی تو وہ اٹھا۔ اس نے حسب معمول اپنے کام کیے۔ مگر لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چوتھی صبح کو اپنے کام نپٹا کر وہ مر گیا ☆☆☆

خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ
مدیر: ضیاء الدین انصاری

دنیا زاد، کراچی
مدیر: آصف فرخی

ذہن جدید، نئی دہلی
مدیر: زبیر رضوی

روشنائی، کراچی
مدیر: احمد زین الدین

سب رس، حیدرآباد
مدیر: مغنی تبسم

شاعر، ممبئی
مدیران: افتخار امام صدیقی، ناظر نعمان صدیقی

شعر و حکمت، حیدرآباد
مدیران: شہریار، مغنی تبسم

صریر، کراچی
مدیر: فہیم اعظمی

فکر و تحقیق، نئی دہلی
مدیر: محمد حمید اللہ بھٹ

فکر و نظر، علی گڈھ
مدیر: آزرمی دخت صفوی

www.taemeernews.com

قاضی سلیم سے گفتگو

رشید انصاری

قاضی سلیم کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اختر الایمان نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ انھوں نے قاضی سلیم کو پہچاننے میں کمی کی تھی۔ اختر الایمان دیانت دار اور وسیع القلب انسان تھے، اس لئے قاضی سلیم کے تعلق سے انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ لیکن قاضی سلیم کو پڑھنے والوں اور نقادوں کی بڑی تعداد مسلسل یہی غلطی کرتی رہی ہے اور قاضی سلیم کو اب تک ان کا حق نہیں مل سکا ہے۔

قاضی سلیم سے اورنگ آباد دکن میں کئی ملاقاتوں کے دوران یہ انٹرویو اقساط میں مکمل ہو سکا۔ چند سوالات کے جواب انھوں نے خود لکھ کر دیئے۔ چند سوالات کے جواب آصف ہاشمی، مدیر انگریزی ماہنامہ Prelude، جو اورنگ آباد سے شائع ہوتا ہے، کو لکھوائے کچھ گفتگو ٹیلی فون پر بھی ہوئی۔ اس طرح مختلف مراحل میں اور مختلف ذرائع سے یہ انٹرویو مکمل ہوا۔ قاضی سلیم چند سال سے علیل ہیں اور ان دنوں وہ طویل ملاقات یا گفتگو کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ انٹرویو کے لئے آمادہ نہ تھے، تاہم آصف ہاشمی اور اورنگ آباد کی معروف بزرگ شخصیت جناب بہاری لال کے اصرار پر قاضی سلیم نے خاصی زحمت اٹھا کر اس انٹرویو کی تکمیل کی۔

قاضی سلیم ان چند گنے چنے شاعروں میں ہیں جو بجا طور پر جدید شاعری کے امام مانے جاتے ہیں۔ جالنہ، جو کبھی ضلع اورنگ آباد میں شامل تھا، قاضی صاحب کا مقام پیدائش ہے، اور ان کی تاریخ پیدائش ۷ نومبر ۱۹۳۰ ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم جالنہ، حیدر آباد دکن اور اورنگ آباد میں ہوئی۔ پھر انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے اور جامعہ عثمانیہ سے ایل ایل۔ بی۔ کی تکمیل کی۔ قانون کی تعلیم مکمل کر لینے کے باوجود انھوں نے وکالت نہیں کی بلکہ تجارت اور سیاست سے وابستہ رہے۔ وہ پرانے کانگریسی ہیں۔ دس سال ۱۹۶۲ تا ۱۹۷۲ مہاراشٹر لجسلیٹو کونسل کے، اور پھر ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۵ تک وہ لوک سبھا کے رکن رہے۔ سیاست سے دلچسپی بہر حال ان کی شاعری پر اثر انداز نہ ہو سکی۔

اختر الایمان نے قاضی سلیم کی شاعری کو "شاخ نہال غم" کا نام دیا ہے۔ قاضی سلیم نے آزاد نظموں کے ساتھ کچھ پابند نظمیں، ثلاثیاں، اور ہائیکو بھی لکھے۔ "باغبان و گل فروش" کے نام سے انھوں نے ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔ عربی کے مشہور جدید شاعر غازی القصیبی نے معروف عربی شعرا کے کچھ کلام کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ قاضی سلیم نے "ریگزاروں کے گیت" کے نام سے کیا۔ ان کا صرف ایک شعری مجموعہ "نجات سے پہلے" (۱۹۶۸) شائع ہوا ہے، دوسرا زیر طبع ہے۔

س۔ اپنے شعری سفر کے آغاز اور اس کے ابتدائی مراحل کے بارے میں ہمیں بتائیے۔

ج۔ شعر و شاعری کا شوق مجھے بچپن سے تھا۔ اس زمانے میں بچوں کے رسالے "پیام تعلیم" کا بڑا زور تھا۔ اس میں میری کئی نظمیں شائع ہوئیں۔ جب میں آٹھویں جماعت میں تھا تو "پیام تعلیم" میں میری ایک نظم میری تصویر کے ساتھ شائع ہوئی تھی تو مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی اور میں نے اس رسالے کو برسوں محفوظ رکھا تھا۔ ادبی رسائل میں سب سے پہلے "آج کل" میں میری نظم شائع ہوئی تھی۔ اسکول میں شعر گوئی کے مقابلوں میں انعامات بھی ملے۔ میرا کوئی استاد نہیں ہے، تاہم اورنگ آباد کی معروف علمی و ادبی شخصیت اور استاد شاعر، مرحوم یعقوب عثمانی صاحب سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہم اپنی ہر نئی تخلیق یعقوب عثمانی صاحب کو دکھاتے تھے اور ان کو دکھائے بغیر کوئی نظم نہ مشاعروں میں سناتے تھے اور نہ ہی کہیں شائع ہونے کے لئے بھجواتے تھے۔ یہی حال بشر نواز کا بھی تھا۔

س۔ ابتدائی دور میں تو آپ نے نظموں کے ساتھ غزلیں بھی کہی ہونگی؟

ج۔ نہیں، میں نے غزل کبھی نہیں کہی۔ عظمت اللہ خاں کے "سریلے بول" پڑھ کر خیال آیا کہ لوگ غزل تو سینکڑوں سال سے کہتے آرہے ہیں کچھ نئی باتیں سامنے آنی چاہیئے۔ کچھ نیا کام بھی ہونا چاہیے۔ پروفیسر آل احمد سرور مرحوم کے ترغیب دینے سے میں نے انگریزی شاعری کا مطالعہ کیا۔ مغرب کی شاعری سے واقفیت ہوئی تو نظم سے دلچسپی اور بڑھی۔

س۔ جب آپ نے شاعری شروع کی تو اس وقت ادبی ماحول کس قسم کا تھا ترقی پسند تحریک سے آپ متاثر ہوئے ہونگے؟

ج۔ جی ہاں، اس وقت ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ ترقی پسندوں کا ہر

www.taemeernews.com

ادبی میدان میں بڑا اثر تھا۔ یہ تحریک ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ مخدوم محی الدین ہیرو مانے جاتے تھے۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی اور مجروح سلطانپوری وغیرہ بہت مشہور و مقبول تھے۔ بیشتر نئے لکھنے والے ان سے متاثر تھے۔ چنانچہ مجھے یہ خیال ضرور آیا کہ جس طرح یہ لوگ نئی نسل کے ہیرو ہیں اسی طرح ہمیں بھی آئندہ نسل کا ہیرو بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ترقی پسندوں سے ہمیں انسان دوستی اور احترام انسانیت کا سبق ملا۔ ترقی پسندوں کی ایک تاریخی کانفرنس بھیونڈی میں منعقد ہوئی تھی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ تمام لکھنے والوں اور شاعروں کو لازماً تحریک کے بتائے ہوئے رہنما خطوط پر چلنا ہوگا۔ پارٹی کے مقرر کردہ دائرے سے جو باہر نکلے گا اسے تحریک سے الگ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ کئی لکھنے والوں کو تحریک سے علیحدہ کر دیا گیا۔ کچھ نے خود علیحدگی اختیار کر لی۔ ہم بھی ان ہی میں سے تھے۔ ہم خیال اور اظہار کی مکمل آزادی کے طلبگار تھے۔ ہم یہ بھی سوچتے تھے کہ صرف معاشی مسائل کے حل ہو جانے سے سارے دکھوں کا علاج نہیں ہو سکتا ہے۔ جیسے جیسے انسان مادی ترقی کرتا ہے ویسے ویسے روحانی اقدار سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طرف خلائی تسخیر جیسی ترقی و کامرانی تھی تو دوسری طرف اتنی ترقی کے باوجود ہماری روحانی قدریں پامال ہو رہی تھیں۔ تمام ترقی اور عروج کے باوجود ہم اس خوب صورت دنیا اور نسل انسانی کی تباہی اور بربادی کے سامان خود اپنے ہاتھوں پیدا کر رہے تھے۔ ہر نئی دریافت کے ساتھ ہی انسانی قدریں، دردمندی اور انسانی احساسات کچھ زیادہ ہی مجروح ہوتے جا رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک اس قسم کی افکار و احساسات سے عاری تھی۔ اسی احساس و آگہی نے ہمیں ترقی پسند تحریک سے دور کیا۔ علاوہ ازیں جب میں نے ن م راشد کے مجموعۂ کلام "ماورا" کا مطالعہ کیا تو ترقی پسند تحریک سے رہی سہی انسیت بھی ختم ہوگئی اور نئی شاعری یا جدیدیت کی طرف رجحان زیادہ قوی ہوگیا۔

س۔ جدیدیت کی جانب مائل ہونے، بلکہ جدیدیت کا آغاز کرنے اور اسے فروغ دینے کا سبب بننے والے دیگر کون سے عوامل تھے؟

ج۔ ترقی پسند تحریک سے ہم مایوس تو ہو چکے تھے، لیکن ہم یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی ہماری اخلاقی اقدار پر تیزی سے اثر انداز ہو رہی تھی۔ ہمارا احساس تھا کہ شاعر کا کام یہ ہے کہ اس طرح جو ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی اس کا اثر زائل کیا جائے اور تہذیب کو اپنی بنیادوں سے جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ جدید شاعری کی اصل بنیاد یہی ہے۔ شاعر کے دل میں انسانیت کا درد معاشرے کے دیگر افراد سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسے باہر سے لادے جانے والے کسی فلسفہ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اس کا اپنا احساس، اپنی فکر، اپنا تجربہ، اپنا مشاہدہ، قالب شعری میں ڈھل کر اظہار کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ احساس غالب تھا کہ تمام نظریات مشتبہ ہوتے جا رہے ہیں، سچ جھوٹ کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے، اس لیے فن کار پر ہی یہ ذمہ داری عائد ہوگئی تھی کہ وہ راہ نجات تلاش کرے۔ فن کار باضمیر ہوتا ہے۔ اس کا باضمیر ہونا انسانیت کے لئے ایک اثاثہ ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی چاہے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے، انسانی معاشرے کو آرٹ، ادب اور شاعری کی ہر حال میں ضرورت رہے گی۔ یہی جدیدیت اور جدید شاعری کا جواز بھی تھا اور یہی عوامل جدید شاعری کے آغاز میں کارفرما رہے تھے۔

س۔ جدید شاعری کے ابتدائی دور کا کچھ احوال بیان فرمائیے۔

ج۔ جدیدیت کے رجحان کی شروعات کرنے والوں میں مرحوم خلیل الرحمن اعظمی، باقر مہدی، بلراج کومل، محمد علوی، عادل منصوری، زبیر رضوی، وحید اختر اور میرے علاوہ کئی دیگر شعرا شامل ہیں۔ ہم نے روایت سے انحراف کیا تھا۔ اس کی زد میں ترقی پسند اور ہمارے پیشرو آ گئے تھے۔ ۱۹۶۸ میں بمبئی میں جدیدیت کی طرف مائل شاعروں کا ایک بڑا اجتماع ہوا تھا۔ عمیق حنفی، عادل منصوری، باقر مہدی اور گریش چندر نے جدید شاعروں کے لئے چند اصول وضع کئے تھے۔ ان اصولوں پر مبنی ایک منشور کا بھی اعلان ہوا تھا۔ اس منشور کا مقدمہ میں نے لکھا تھا۔ لیکن بعد میں اس بات پر اتفاق رائے ہوا تھا کہ چونکہ متعدد بے انتہا ذہین شعرا میدان میں آ رہے تھے، نت نئے تجربات اس کثرت سے ہو رہے تھے کہ لگتا تھا کہ تجربات کا سیلاب آ گیا ہے، اس لئے اس منشور پر اصرار نہ کیا جانا ہی بہتر ہے۔ اس لئے منشور کو ملتوی رکھا جانا طے پایا تھا۔ آزادی اظہار و بیان، اور موضوعات و مضامین کے انتخاب میں آزادی کے سبب جدیدیت سے متاثر مختلف شعرا کی شاعری ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ ویسے بعض چیزوں میں ہم متحد الخیال بھی تھے (مذکورہ منشور تا حال عملاً معرض التوا میں ہے)۔

س۔ جدید شعرا پر "روایت" سے انحراف کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس میں کہاں تک صداقت ہے؟

ج۔ بعض حلقوں کی جانب سے ہم پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ہم روایت کا احترام نہیں کرتے ہیں، فن شعر کی روایات سے انحراف کرتے ہیں۔ لیکن یہ الزام غلط ہے۔ ہاں، ہم اس سلسلے میں کچھ تحفظات ضرور رکھتے ہیں۔ ہم روایت کا احترام کرتے ہیں، بلکہ میں نے جس منشور کا ذکر کیا ہے اس میں بھی اس تعلق سے ایک دفعہ رکھی گئی تھی۔ ہم صرف اپنی ہی روایات کے قائل تھے، باہر سے عائد کی گئی روایت کے نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ، بین الاقوامی زبانوں کے ادب کی وہ روایات جو حسن اور آہنگ کی صورت میں ہم تک پہنچی ہوں، ان سے بھی استفادے کا خیال ہم نے پیش کیا تھا۔

س۔ جدید شاعری میں جو تجربات کئے گئے ان کا عمومی اثر کیسا رہا اور کیا نتائج نکلے؟

ج۔ ہم نے اظہار و بیان میں لغت کے الفاظ، تشبیہات اور استعارے استعمال کرنے کے ساتھ رمز و کنایہ اور علامات Symbols & Symbolic Images سے اپنے شاعری کو سنوارا تھا۔ تجرباتی شاعری کے سلسلے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ تجرباتی شاعری کامیاب ہوتی ہے، تو بعد میں اسے شاعری کی روایت مان لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی تجربہ ناکام ہو تو اسے مسترد کر دیا جاتا ہے۔ بعض تجربات سے بے راہ روی کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ جدیدیت کا جب آغاز ہوا تو کئی انتہا پسند شاعروں نے اپنی ذاتی علامات کا جو مبہم اور ناقابل فہم تھیں استعمال کیا۔ ان

www.taemeernews.com

مہمل علامات کے استعمال سے غیر ضروری اور خاصا ناگوار ابہام پیدا ہوا اور شاعری ایک معما بن کر رہ گئی۔ اسی وجہ سے جدید شاعری پر بے انتہا اعتراضات بھی کئے گئے، لیکن جن شاعروں نے ابہام میں بھی اعتدال برقرار رکھا ان ہی شاعروں کے نام زندہ رہ گئے اور کئی شاعر تجربات میں حد سے آگے نکل جانے یا اپنی انتہا پسندی کا شکار ہو گئے۔

س۔ آپ جدیدیت کے زبردست علمبردار ہیں، بلکہ اس کی تاسیس میں آپ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ تاہم تجربات و ابہام کی انتہا پسندی مثلاً ''سورج کو مرغے کی چونچ میں دبائے رکھنے'' والی قسم کی شاعری سے نہ صرف آپ نے بلکہ چند اور شعراء نے بھی گریز کیا۔ آخر ایسا کس طرح ممکن ہوا، یہ اہتمام آپ نے کس طرح کیا؟

ج۔ آپ مجھ سے کچھ زیادہ ہی خوش گمان ہیں۔ یہ آپ کی محبت اور کرم فرمائی ہے۔ ویسے ابہام کا ٹھپہ مجھ پر لگ چکا ہے۔ میرے ایک نقاد (فضیل جعفری) نے میرے بارے میں لکھا تھا کہ بسا اوقات متعدد مرتبہ پڑھنے کے باوجود بھی میری نظموں میں معنی کے امکانات پوری طرح واضح نہیں ہو پاتے ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ میں نے الفاظ و علامات کو برتنے میں انتہا پسندی، بے اعتدالی اور بے احتیاطی سے اجتناب کیا اور یہی بات میری کام آئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری کی ترسیل اور ابلاغ کو شاعر کے لئے ایک چیلنج کی طرح قبول کرنا چاہئے۔ اس معاملہ میں ہر ایک کا اپنا کردار ہے جو اسے بہ حسن و خوبی ادا کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاعری وہی پسند کرتا اور پڑھتا ہے جس کے اندر خود شاعری کے امکانات موجود ہوں۔ ایسی صورت میں وہ اپنے اندر کے شاعر کو متاثر اور متحرک کرتا ہے جس کا سبب شاعر ہوتا ہے۔

میں اپنے اندرونی دکھ اور کرب کو خوب سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اپنے دکھ کا اظہار کر کے میں ایک دو قاری یا سامع کو متاثر کر سکوں گا۔ لیکن بار بار اعادہ کرنے سے وہ اکتا جائے گا۔ تاہم اگر میں ایسے Symbols (علامات) کا اور Images کا استعمال کروں جو قاری یا سامع کو پوری انسانیت کے دکھوں کا احساس دلا سکیں تو اپنی گہرائی اور اثر پذیری کی وجہ سے میری نظم شاید زیادہ متاثر کن ہوگی۔ ایسی ہی شاعری زیادہ پسند کی جاتی ہے اور زندہ بھی رہتی ہے۔ مزید یہ کہ میں خود احتسابی اور تخلیق پر غور و فکر کے بعد ہی اسے اپنے سامع یا قاری کے آگے پیش کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی جس تخلیق سے میں خود مطمئن ہوں گا وہی دوسروں کو بھی مطمئن کر سکے گی۔

س۔ نثری نظم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ میں اردو زبان کی حد تک نثری نظم، بلکہ نثری شاعری کو ضروری نہیں سمجھتا ہوں کیوں کہ آہنگ ہماری زبان میں شامل ہے۔ خواہ ہندی ہو یا فارسی دونوں ہی میں آہنگ جملوں کی ترتیب میں شامل ہے۔ جب زبان ہی آہنگ سے اس قدر متاثر ہو کہ آہنگ نثر میں رچ بس جائے تو اس آہنگ کو ہی بطور ہتھیار یا آلۂ کار موثر انداز میں استعمال کرنا چاہئے کیوں کہ تاثر پیدا کرنے کی مہم میں شاعر زبان کی اس صفت سے خاص فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اپنا خیال موثر انداز میں پیش کر سکتا ہے۔ میں تاثر سے عاری شاعری کو بے فائدہ گردانتا ہوں۔

س۔ اپنی علی گڑھ کی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ج۔ علی گڑھ کا قیام میری زندگی کا یادگار دور ہے۔ نصابی علم کے ساتھ غیر نصابی علم حاصل کئے۔ بہت کچھ سیکھا اور سمجھا۔ آل احمد سرور، معین احسن جذبی، خورشید الاسلام اور مسعود حسین خاں جیسے اساتذہ کی شاگردگی کا شرف حاصل ہوا۔ باقر مہدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، قاضی عبدالستار اور شہریار جیسے دوست ملے۔ ہم جب جدیدیت کی طرف آئے تو ہمارا ایک ہم آہنگ حلقہ بن گیا۔ یہ بتا دوں کہ رسائل و جرائد میں مجھ سے اور باقر مہدی سے پہلے خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم چھپنے لگے تھے۔

س۔ اپنی ذات، اپنی پسند ناپسند کے بارے میں کچھ بتایئے۔

ج۔ انور معظم، بشر نواز، بہاری لال، باقر مہدی، شہریار، مجتبیٰ حسین میرے بہترین دوست ہیں۔ غالب اور ن م راشد میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ یوں تو میں کئی شہروں میں رہ چکا ہوں، تاہم اورنگ آباد میرا پسندیدہ شہر ہے۔ کرتا پاجامہ میرا پسندیدہ لباس اور Hamlet اور ''انارکلی'' پسندیدہ ڈرامے ہیں۔ بلیرڈ Billiard اور گھوڑسواری اور میٹھے پکوان کا میں دلدادہ ہوں۔ میں زندگی بھر جیو اور جینے دو کا قائل رہا ہوں ☆☆☆

فنون، لاہور
مدیران : احمد ندیم قاسمی، منصورہ احمد

کاروانِ ادب، بھوپال
مدیر، کوثر صدیقی

مباحثہ، پٹنہ
مدیر، وہاب اشرفی

معارف، اعظم گڈھ
مدیر: ضیاء الدین اصلاحی

مکالمہ، کراچی
مدیر: مبین مرزا

نیا ورق، ممبئی
مدیر، ساجد رشید

www.taemeernews.com

ایڈیٹروں کے مصائب

(۱) ''ارن میلی'' اور ایلن سوکیل فریب

جدید مغربی ادب کی تاریخ، اور ادبی تنقید کے نظری مباحث کے ماہرین کے حلقے میں شرمندگی کا پسینہ لانے والا اگر کوئی ایک واقعہ ہے تو وہ ''ارن میلی فریب'' (Ern Malley Hoax) ہے۔ ہوا یوں کہ آسٹریلیا کے ادبی رسالے The Angry Penguin کے مدیر میکس ہیرس (Max Harris) کے رعونت آمیز رویے اور جدید شاعری سے اپنی ناخوشی کے اظہار کے لئے جیمس میک آلی (James MacAuley) اور ہیرلڈ اسٹوارٹ (Harold Stewart) نامی دو نوجوانوں نے یہ کھیل رچا کہ ایتھل میلی (Ethel Malley) نامی ایک فرضی خاتون اور اس کے متوفی بھائی ارن میلی (Ern[est] Malley) کا قصہ گھڑا کہ ارن میلی ایک نیم خواندہ مستری لیکن شعروادب کا ذوق رکھنے والا شخص تھا۔ وہ چپ چاپ نظمیں لکھتا اور انھیں اپنے کاغذوں میں دبا دیتا کیوں کہ اسے اپنی شاعری پر اعتماد نہ تھا، اور نہ اس کے تعلقات ہی کسی ادبی حلقے سے تھے جہاں سے اسے ہمت افزائی یا ادبی اطلاعات حاصل ہوتیں۔ اس کی موت کے بعد اس کی بہن ایتھل کو اس کی نظمیں اتفاقاً ہاتھ لگیں۔ میک آلی اور اسٹوارٹ نے ''ایتھل'' کی طرف سے ایک خط لکھ کر یہ نظمیں (جو تعداد میں سترہ تھیں) ہیرلڈ ہیرس کو بھیج دیں۔ ہیرس ان نظموں اور نیم خواندہ گمنام ارن میلی کی داستان حیات سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے قرار دیا کہ ارن میلی کی شاعری انتہائی تازہ کاری اور شدت احساس کا نمونہ ہے۔ ہیرس نے اپنے رسالے کا خاص نمبر شائع کیا اور اس میں میلی کی سترہ کی سترہ نظمیں چھاپ دیں اور پھر انھیں ایک مجموعے کی شکل میں بھی شائع کر دیا (۱۹۴۴) جس کا نام اس نے The Darkening Epileptic رکھا۔

ان واقعات کے کوئی نو مہینے بعد میک آلی اور اسٹوارٹ نے بھانڈا پھوڑا کہ نہ ایتھل میلی کا وجود ہے نہ اس کے نیم خواندہ شاعر بھائی ارن میلی کا۔ اور ارن میلی کی ''نظمیں'' کچھ نہیں ہیں، بس طبی رسالوں سے الل ٹپ کاٹے گئے تراشوں، شیکسپیئر کے سانیٹوں سے اڑائے ہوئے ادھر ادھر کے اقتباسات، اور حکومت کی سرکاری رپورٹوں کے بے مقصد اقتباسات کا غیر منظم مجموعہ ہیں۔ میک آلی اور اسٹوارٹ نے کہا کہ ہیرس صاحب کی شعر فہمی، ادارتی تھسے، اور ادبی ''نقادوں'' کی باریک بینی کے دعووں کا سارا ڈھول صرف پول ہی پول ہے۔ قومی سطح پر اخبارات اس معاملے کو لے اڑے اور میکس ہیرس، اور دوسرے ''ماہرین ادب'' کی خوب جگ ہنسائی ہوئی۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ چند سال پہلے ایک امریکی نقاد اور دانشور ایلن سوکیل (Alan Sokal) نے بھی ایسا ہی مذاق امریکہ کے مشہور رسالے Social Text کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے نام نہاد جدید ''تھیوری'' کی زبان استعمال کرتے ہوئے ایک بظاہر ادق لیکن درحقیقت بے معنی مضمون Social Text کو بھیجا۔ اس کے مدیران میں اسٹینلی فش بھی تھے، جو اس وقت ''تھیوری'' کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ (اب ان کے خیالات کچھ بدل گئے ہیں)۔ سوکیل کا مضمون Social Text میں فوراً چھپ گیا۔ اس کے بعد سوکیل نے اپنے مذاق پر سے پردہ اٹھایا اور تھیوری والوں کی خوب ہنسی اڑی لیکن یہ اس ہنسی اور تحقیر کے آگے کچھ نہیں جو بچارے ہیرس اور اس کے ہمنواؤں کا مقدر بنی۔

لطف کی بات یہ ہے کہ بعض نقادان سخن اپنی ضد پر اڑے رہے کہ نہیں صاحب، ارن میلی کا وجود ہو نہ ہو، لیکن یہ ''نظمیں'' بڑی جاندار ہیں! سنا گیا ہے اب بھی آسٹریلیا کے ادبی حلقوں میں حضرت ''ارن میلی'' کے مرید کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔

(۲) ازرا پاؤنڈ اور رسالہ ''پوئٹری''

ہم نے گذشتہ کسی شمارے میں شکاگو کے مشہور رسالے Poetry کا ذکر کیا تھا کہ یہ رسالہ ۱۹۱۲ سے جاری ہے اور اب جدید شاعری کی تاریخ کا اہم نام بن گیا ہے۔ حال میں دو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ایک تو اس میں شائع شدہ نظموں کا ضخیم انتخاب ہے، اور دوسری کتاب Poetry کی پہلی نصف صدی کے دوران اس میں شائع شدہ مراسلات کا انتخاب ہے۔ Poetry کے موجودہ ایڈیٹر جوزف پریزی (Joseph Parisi) اور اسٹیفن ینگ (Stephen Young) دونوں کتابوں کے مرتب ہیں۔ ہیریٹ مانرو (Harriet Monroe) نے جب یہ رسالہ شروع کیا تھا تو اس کی مجلس ادارت میں ازرا پاؤنڈ کا بھی نام بطور ''غیر ملکی نامہ نگار'' درج تھا۔ اور کوئی شک نہیں کہ پاؤنڈ نے رسالے کی ترقی و ترویج میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ لیکن پاؤنڈ کی طبیعت میں نچلا بیٹھنا تھا ہی نہیں۔ اس نے ۱۹۱۷ میں Little Review نامی رسالے میں بھی ایک جگہ قبول کر لی اور یہی نہیں، اس نے ہیریٹ مانرو کے بارے میں نازیبا باتیں بھی لکھیں۔ ہیریٹ مانرو چپ بیٹھنے والی خاتون نہ تھی۔ اس نے Poetry میں پاؤنڈ کو جوابی مراسلہ لکھا جس میں اس نے کہا:

> تمھارے اندر کوئی شے ایسی ہے جو تمھیں اس بات کو سمجھنے سے باز رکھتی ہے کہ تھوڑا سا، بالکل ابتدائی درجے کا، سلیقہ اور نزاکت عمل ایک شے ہے، اور مفاہمت کچھ اور شے۔ دونوں ہم معنی نہیں ہیں۔

یہ نہیں معلوم کہ پاؤنڈ نے خنجر کے اس لطیف چرکے پر کیا ردعمل ظاہر کیا۔ لیکن ہیریٹ مانرو کی بے غرضی اور عالی ظرفی دیکھئے کہ وہ پاؤنڈ کا کلام اپنے رسالے میں پھر بھی چھاپتی رہی۔

کہتی ہے خلق خدا

⚫ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی گفتگو پر مبنی مضمون (''شب خون'' شمارہ ۲۶۹) بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا اس لئے کہ یہ راجندر یادو کے جس اداریے کا ردعمل ہے اسے میں پڑھ چکی تھی۔ یہ اداریہ ''ہنس'' کے ستمبر ۲۰۰۲ کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ رسالہ میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ سطریں سپرد قلم کرنے سے پہلے میں نے اسے دوبارہ پڑھا۔

''ہنس'' میں کم و بیش باقاعدگی کے ساتھ پڑھتی ہوں، اس لئے یادو جی کی تحریریں نظر سے گذرتی رہتی ہیں۔ ان کی زبان نہایت ناہموار ہوتی ہے اور کبھی کبھی ناشائستہ بھی۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کے اداریوں سے جو تاثر ابھرتا ہے وہ ایک صاف، سیکولر اور انصاف پسند ذہن کا ہے۔ ہندوستان کی فرقہ پرست اور فسطائی ذہن رکھنے والی سیاسی تنظیموں کو راجندر یادو نہایت بے باکانہ انداز میں پھٹکارتے رہتے ہیں، بلکہ جیسا کہ میں نے کہا، ان کی زبان اکثر شائستگی کی حدود سے آگے نکل جاتی ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی کے دوران جن لوگوں نے مظلوم مسلمانوں کے حق میں آواز اٹھائی ان میں ''ہنس'' پیش پیش تھا۔ صرف اداریے ہی نہیں بلکہ اس میں شائع ہونے والے دیگر مضامین اور نظمیں وغیرہ بھی مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مذمت میں پیش پیش رہیں۔

واقعات کی ابتدا میں ہی ''ہنس'' کے غالباً اپریل ۲۰۰۲ کے شمارے میں کاتیاینی کی ایک طویل نظم شائع ہوئی تھی جس میں انھوں نے مظلوموں کو للکارا تھا کہ تم ہاتھ میں گھن (ہتھوڑا) اٹھا کر ظالموں کا سر کیوں نہیں کچل دیتے، خاموش کیوں ہو؟ ایسی بے باک نظم کسی اردو شاعر نے نہیں کہی نہ کسی اردو رسالے میں شائع ہوئی (ہوسکتا ہے کہ میرا محدود مطالعہ یہ کہنے کا سبب ہو، لیکن میں سمجھتی ہوں فرقہ پرستی کا لیبل لگ جانے کے ڈر یا ایک عمومی خوف کی وجہ سے مسلمان ایسا نہیں کہہ پاتے اور شاید ایسی اور کوئی نظم نہیں کہی گئی ہے جس میں عملی طور پر کچھ کرنے کے لئے للکارا گیا ہو۔) اس لئے اگر راجندر یادو کچھ ایسا کہتے ہیں جو ہمارے لئے ناقابل قبول ہو تو بھی اسے اس پورے تناظر سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔

''ہنس'' کا اگلا شمارہ (اگست ۲۰۰۳) خاص نمبر ہے۔ جس کا موضوع ہے ''ہندوستانی مسلمان: حال اور مستقبل''۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس شمارے کے مضامین میں خلوص نیت اور ہمدردی کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل زیر بحث آئیں گے۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی انتہائی ذی علم، باوقار اور سنجیدہ انسان ہیں۔ ان کے اس مضمون میں ان کے لہجے کی برہمی کھٹک رہی ہے۔ وہ کہتے نظر آرہے ہیں کہ راجندر یادو تم کون ہو ہمارے معاملات میں بولنے والے۔ لیکن کیا ہزار برس کے ساتھ کے باوجود مسلمانوں کے معاملے میں ہندو، اور ہندوؤں کے معاملے میں مسلمان دخل اندازی نہیں کر سکتے؟ ایک دوسرے کے کو بز زیر بحث نہیں لا سکتے؟ اسلام ایک نہایت عملی، مبنی بر منطق، مبنی بر فطرت، انسانی مذہب ہے۔ لیکن بحیثیت ایک مذہبی گروہ ہندوستان یا دوسرے ممالک میں ہم نے اسے جس طرح مسخ کر کے رکھا ہے کیا اس کی طرف انگلی اٹھانے کا کسی کو حق نہیں، خصوصاً اس وقت جب اس کی نیت خراب نہ ہو؟ اگر جو کچھ کہا جارہا ہے اس میں غلط فہمیوں اور تعصب کا دخل ہو تو اسے سہولت سے سمجھایا جاسکتا ہے۔ کبیر داس نے کہا کہ مسلمان کنکر پتھر جوڑ کے مسجد بناتا اور اس پر چڑھ کے بانگ دیتا ہے۔ کیا اس کا خدا بہرا ہوگیا ہے؟ کبیر کو بتانے کی ضرورت تھی کہ اذان خدا کو سنانے کے لئے نہیں بلکہ خدا کے بندوں کو یہ بتانے کے لئے دی جاتی ہے کہ آجاؤ نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ راجندر یادو نے اپنے اداریے کی پیشانی پر ہی کہہ دیا ہے،'' میں تسلیم کرتا ہوں کہ اسلامی فلسفے، تاریخ اور مذہب کی دوسری باریکیوں کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ میں نے یہاں جو کچھ لکھا ہے اسے صرف 'جنرل پرسپشن' یا عمومی تصویر کا ہی نام دیا جاسکتا ہے۔ ہم اپنی رائے اکثر انھیں تصویروں کی بنا پر قائم کرتے ہیں۔''

میں مراسلے کو مراسلہ رہنے دینا چاہتی ہوں اس لئے تمام نکتوں کو انفرادی طور پر اٹھا کر ان سے بحث نہیں کرنا چاہتی۔ صرف اتنا کہوں گی کہ جس شخص نے بے انصافی اور ظلم کی مخالفت پر کمر باندھ رکھی ہو اس سے یہ کہنا مناسب نہیں کہ جاؤ میاں اپنی راہ ناپو۔ اگر اس کے '' پرسپشن'' غلط ہیں تو انھیں ہمدردی کے ساتھ دور کیا جانا چاہئے۔ برہمی کے ساتھ جوابی حملہ کر کے نہیں۔

ذکیہ مشہدی
پٹنہ

⚫ '' شب خون'' ۲۶۹ میں دو مضامین کی شمولیت کا جواز میری سمجھ کے باہر ہے۔ پہلا آپ کا جواب راجندر یادو کو اور دوسرا رابن جفری کا مضمون '' پنجاب کیسری'' کے حوالے سے۔ یادو نے بے شک بے تکی باتیں کی ہیں۔ لیکن کیا وہ واحد شخص ہے جو اس طرح کی باتیں کرتا ہے؟ اور پھر ادبی جریدہ میں اس کا شامل کرنا محض اس کے خیالات کی بالواسطہ تشہیر کرنے کے مترادف ہے۔ ایک خالص مذہبی معاملے میں یادو کی معلومات نظر انداز کرنے کے قابل ہے، اور آپ کا ڈانٹ ڈپٹ کا لہجہ آپ کی سطح کے دانشور کے لئے مناسب نہیں ہے۔ بیشک آپ نے باتیں کیں اور وہ ریکارڈ کر لیں گئیں۔ آپ کے خیالات کو شائع کرنے کے لئے '' جن مت'' کا قدم اس جریدے کی شان میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ لیکن '' شب خون'' جیسا ادبی جریدہ اس کے لئے کہاں موزوں ہوسکتا ہے؟ میں تو حیران تھا کہ آپ نے کیوں شائع کیا۔

آپ کے جریدے میں رابن جفری کے مضمون کی اشاعت اس سے بھی بدتر ادارتی فیصلہ ہے۔ اس مضمون کا تعلق بھی بنیادی طور پر مذہبی معاملات سے ہے نہ کہ ادبی مسائل سے۔ شاید یادو کی باتوں کی طرح آپ کو میری باتیں بھی '' سخن گسترانہ'' لگیں، مگر میں نیک دلی سے کہہ رہا ہوں۔ یادو کے رویہ اور ذہن پر کچھ تبصرہ نہ کیا جائے تو بہتر ہی ہے۔ اور ۸۰ صفحات میں سے ۲۰ صفحات ان بے معنی اور فالتو باتوں پر صرف کر دیے جائیں تو میں احتجاج کرنا ضروری سمجھتا ہوں، اس بات سے قطع نظر کہ یادو کے خیالات گھٹیا ہیں اور رابن جفری کے حقائق نہایت صحیح۔ لیکن کیا تنگ مذہبی دیوانے مسلمانوں میں نہیں ہیں؟ کیا اردو پریس (اکثریت مسلم) تعصب کا شکار نہیں؟ میں پھر دہراتا ہوں: یہ دونوں مضامین آپ

www.taemeernews.com

کے جریدے کو زیب نہیں دیتے۔

نئی دہلی — پرکاش چندر

❁ ''ٹکراؤ تہذیبوں کا نہیں، طاقت کا ہے'' جیسے جرأت مندانہ اور مسکت (اگر مطالعہ کرنے والے میں، اور خود راجندر یادو میں ذرا سی بھی دیانت ہو،) ردعمل کے لئے آپ کو مبارکباد کا خط لکھنا ضروری ہوگیا۔ بلاشبہ اس گفتگو میں آپ نے ایک پورے تہذیبی سماج کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا۔ راجندر یادو نے چند ماہ پہلے جب گجرات قتل عام کے بارے میں ''ہنس'' میں اداریہ لکھا تھا تو ہمارے بعض خوش فہم احباب بہت خوش ہوئے تھے، لیکن اس کے متعلق ناچیز کے چند تحفظات تھے۔ ہر شخص ارون دھتی رائے، یا ہرش مندیر، یا تیستا سیتلواد، یا برندا کارت، یا سدھارتھ وردھراجن نہیں ہوسکتا۔ بہر حال زیر گفتگو مضمون سے یادو کا اصل چہرہ سامنے آگیا، ایک خاص انسانی گروہ اور تہذیبی اور لسانی حلقے کے خلاف غیر عقلی الزامات، مزعومات، نفرت اور بیزاری کی سیاہی سے لکھا ہوا۔ یہ بھی قابل تحسین ہے کہ جواب بھی اسی شخص کے روزمرہ میں دیا گیا ہے۔

لکھنؤ — عرفان صدیقی

❁ ''ٹکراؤ تہذیبوں کا نہیں، طاقت کا ہے'' دیکھا، پڑھا اور پھر پڑھا۔ آپ کی مدلل، معقول اور دوٹوک باتیں دل پر اثر کرگئیں۔ کاش اس جرأت کا مظاہرہ کچھ اور لوگوں نے کیا ہوتا تو شاید صورت حال میں کوئی تبدیلی پیدا ہوتی۔ تسلیمہ نسرین کی ''لجا'' نے ایک حقیقت سے پردہ اٹھایا تھا اور وہ ایک قابل ستائش قدم تھا۔ لیکن مخالفت کے جواب میں اس نے جو یاوہ گوئی کی اور بعض حلقوں نے اس کا تالیاں بجا کر جو خیر مقدم کیا وہ مذموم حرکت تھی۔ ویسے تسلیمہ نسرین کا کوئی ادبی مقام نہیں ہے، اسے اس کے پراگندہ خیالات کی وجہ سے اچھالا جارہا ہے۔ سلمان رشدی کی ادبی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اسے جو ایک روشن خیال، حق گو اور بے باک ادیب بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے وہ ریاکاری کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ساقی فاروقی نے اس سلسلے میں بہت خوب لکھا ہے:

''برطانیہ کے مشہور آزاد خیال اخبار Independent نے رشدی کے دفاع میں کم از کم دو اداریے لکھے۔ کیمبرج کے ایک سفید عیسائی انگریز پروفیسر نے اخبار کو خط لکھا: ''اگر رشدی کی ہڈیوں میں گودا ہے تو وہ مغرب میں بیٹھ کر عیسیٰ اور موسیٰ کے بارے میں ایسی ہی ہتک آمیز تحریر لکھ کر دکھادے۔''''

(''آپ بیتی / پاپ بیتی'' از ساقی فاروقی ص ۴۸۶-۴۸۸، مکالمہ ۹، کراچی)

ہمارے ملک میں ایم۔ ایف۔ حسین کی ایک تصویر پر جو لے دے ہوئی وہ حافظے سے اتری نہیں ہے اور ''شیکسپیر کی سیتا'' اسٹیج کرنے کے سلسلے میں اس ڈراما نگار کی جو درگت کی گئی اسے شاید لوگ بھول گئے۔ اُدارتا، سہن شیلتا، وشو بندھوتا اور مانوتا کے پرچارک ذرا اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں۔

لارنس ویل، جارجیا — وحید الحسن

❁ راجندر یادو کے مضمون / اداریے کے جواب میں آپ کی گفتگو سے اس لسانی جدل کا اندازہ ہوا جس میں آپ لوگ بسر کر رہے ہیں۔ آپ نے دلائل و براہین سے بات کی ہے اور موصوف کے اتہامات کے مدلل جواب دیئے ہیں جو شاید وہاں کے لسانی ماحول میں صرف آپ ہی دے سکتے تھے۔ آپ کے لہجے میں جو تلخی ہے وہ اس لئے فطری ہے کہ جان بوجھ کر منافرت پھیلانے والوں سے ایسے ہی لہجے میں بات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ابرار احمد کی غزلوں نے لطف دیا مگر افضال نوید کی غزلیں اتنی ہی بے کیف لگیں۔ نہ معلوم موصوف کس راہ پر چل پڑے ہیں کہ کوری جدیدیت (یا پس جدیدیت؟) کے پردے میں مضمون غتربود ہوجاتا ہے۔

لاہور — غلام حسین ساجد

❁ فاروقی صاحب کا مضمون ''ٹکراؤ تہذیبوں کا نہیں...'' عالمانہ تو ہے ہی، مگر علمی پہلو سے زیادہ قابل توجہ مضمون کا لہجہ اور تیور ہے۔ سیدھی، صاف اور کھری بات دوٹوک لہجہ میں کہنا، اور اس قدر سلیقے سے کہنا، لائق ستائش وتحسین ہے۔ فاروقی صاحب کو اردو زبان سے جو لگاؤ ہے وہ اس تحریر کے لب ولہجہ میں صاف جھلکتا ہے۔ اردو رسم الخط کے تعلق سے ان دنوں مختلف حلقوں کی جانب سے تخریبی باتیں اٹھائی جارہی ہیں۔ یہ سارا شور وغوغا یا تو سادہ لوحی پر مبنی ہے یا بد نیتی پر۔ سچی بات تو بس اتنی ہے کہ ہر زبان اپنا رسم الخط لے کر پیدا ہوتی ہے جسے بدلنے کا خیال یا تحریک اس زبان کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔

الہ آباد — ابو اللیث صدیقی

❁ ''ٹکراؤ تہذیبوں کا نہیں، طاقت کا ہے'' راجندر یادو کا ہی مسئلہ نہیں۔ ہندتوا کے حامی ادیب ایسی ہی سطحی باتیں کرتے رہے ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ان کے لئے اسٹیج فراہم ہے، اور مسلمانوں کا پرنٹ میڈیا اتنا کمزور اور بے حس ہے کہ انھیں جواب نہیں دیتا۔ لوگ ''اسلامی دہشت پسندی'' کی اصطلاح دھڑلے سے استعمال کرتے ہیں لیکن اہل اسلام کی طرف سے کوئی احتجاج نہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سارے ٹھگ، خواہ وہ مسلمان ہوں خواہ ہندو، کالی دیوی کے پجاری ہوتے ہیں۔ اور کالی دیوی کی پوجا کے بعد ہی، (بلکہ ان کے بقول، دیوی کے اشارے پر) مہم پر نکلتے ہیں اور لوٹ مار کرتے ہیں۔ پھر بھی کسی نے نہیں کہا کہ ہندومت لٹیروں کی پرورش کرتا ہے اور رہزنی کو فروغ دیتا ہے۔ کیا یادو جی کو نہیں معلوم کہ کوئی مذہب دہشت پرست نہیں ہوتا؟ آپ کا ردعمل ان کے لئے سبق آموز تو ہے لیکن وہ پڑھنا چاہیں تب تو۔

نئی دہلی — جاوید رحمانی

❁ راجندر یادو کا مضمون ایک سے زائد جرائد میں چھپ چکا ہے۔ طاقت کا ٹکراؤ آپ نے ثابت کردیا۔ ان دنوں ہم لوگوں میں اسی پر بات ہوتی ہے۔ اس سے بہتر جواب شاید ہی کوئی اور دے سکے۔

حیدرآباد — قدیر زماں

❁ تازہ شمارے ۲۶۹ میں راجندر یادو کے ''ہنس'' میں شائع اداریے کے جواب میں آپ کا مضمون ''ٹکراؤ تہذیبوں کا نہیں، طاقت کا ہے'' جس کا ترجمہ

www.taemeernews.com

نجم فاروقی صاحب نے کیا ہے، بہت ہی متوازن، مدلل اور واضح ہے۔ راجندر یادو سے جہاں جہاں دانستہ یا لاعلمی کی وجہ سے غلط مبحث ہوا ہے، آپ نے اس کی بڑی صاف نشاندہی کی ہے۔ ''ہندی صحافت، 'پنجاب کیسری' کی راہ پر'' بھی بہت معلوماتی اور دستاویزی مضمون ہے جو حوالوں اور اعداد وشمار کے ساتھ ہندی صحافت کے تازہ پہلوؤں کا تجزیہ کرتا ہے۔

بشر نواز کی نظمیں اور حمایت علی شاعر کی غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ افضال نوید کے یہاں بیشتر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

ممبئی — عبدالاحد ساز

❁ آپ نے ریاکارانہ مصلحت انگیزی سے پاک، واضح اور دوٹوک انداز میں راجندر یادو کے حوالے سے کم فہم اور فرقہ وارانہ ذہنیت اور نام نہاد مفکر و دانشور حضرات کو جواب دیا ہے۔ آپ کا بیان قابل تحسین ہی نہیں، قابل قدر بھی ہے۔ اس تحریر کا سب سے زیادہ آنکھیں کھولنے والا نکتہ وہ ہے جہاں آپ نے شریعت کی نام نہاد تنگ خیالی کے باب میں کثیر تعداد میں قرآن کی تفاسیر کے لکھے جانے اور ہر شارح کے اس بات پر اصرار کی بات کہی ہے کہ میں ہی قرآن کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کم از کم میرے لئے یہ دلیل بالکل نئی اور کسی دریافت سے کم نہیں ہے۔ اس نکتہ پر تو میرا دھیان کبھی گیا ہی نہیں تھا، اور شاید میری طرح اوروں کو بھی یہ نکتہ نیا معلوم ہو۔

بریلی — خان جمیل

❁ مسعود اشعر نے افسانہ ''اپنا گھر'' میں لفظ 'نہ' اور 'نا' کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا۔ 'نا' کے مقام پر اکثر 'نہ' (نہیں) کا استعمال کیا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی تو نہیں؟(۱)

آپ کا غم وغصہ سے بھرپور مکالمہ ''ٹکراؤ تہذیبوں کا نہیں، طاقت کا ہے'' پڑھا۔ ابتدائی سطور نے غالب کے اس شعر کی معنویت میں اضافہ کر دیا۔

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

پورا مکالمہ ظاہر ہے سنے ہوئے مضمون کا ردعمل تھا۔ اگر تحریری ردعمل ہوتا تو اور موثر ہوتا۔ دراصل ہوتا یہ آیا ہے کہ ہم ہندی والوں کے لعن طعن پر ہنس کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں، یا صرف افسوس پر اکتفا کرتے ہیں۔ راجندر یادو کی طرح امرت رائے اور مہادیوی ورما جیسے ذمہ دار لوگ بھی اردو کے خلاف زہر اگلتے رہے اور ہم خاموش بیٹھے منہ تکا کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئی نسل بھی ان کی آواز میں آواز ملانے لگی اور اسے ثبوت کے طور پر پیش کرنے لگی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اگلی صف کے دانشور صاحبان تمام حملوں کا انھیں کی زبان میں بھرپور جواب دیتے (آپ کی طرح بے خوف ہوکر) تو کم از کم نوجوان نسل کو منہ تو نہ دیکھنا پڑتا۔ بہرحال آپ کے مکالمے میں غم وغصہ کے ساتھ بے خوفی اور بے باکی ٹپکتی ہے۔

اجین — واجد قریشی

❁ شمارہ ۲۶۹ میں مشمولات کے کئی عنوانات معلومات میں اضافہ اور ذوق کی سیرابی کا سامان کرتے ہیں۔ سرقہ اور طبع زاد کی تفہیم سے کئی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ ''تمام شاعری اصولاً کسی نہ کسی معنی میں حوالہ پذیر ہوتی ہے''، یہ بات ہم سب کے لئے غور وفکر کا موجب ہے۔

''ٹکراؤ تہذیبوں کا نہیں...'' ایسی تحریر ہے جسے پڑھ کر راجندر یادو کے بھگت تلملا اٹھ سکتے ہیں۔ زبان اور تہذیب کے معاملے میں ان کے دل کا چور اکثر پکڑا گیا ہے۔ آپ نے راجندر یادو کو نہ صرف لاجواب کیا ہے بلکہ انھیں سوالات کے کٹہرے میں بھی لا کھڑا کیا ہے۔

بشر نواز، مدحت الاختر، غلام حسین ساجد، افضال نوید کی شاعری نے کچھ نیا کہنے کی تحریک پیدا کی ہے۔

دھنباد — رونق شہری

❁ آپ کا مضمون یا بیان بعنوان ''ٹکراؤ تہذیبوں کا نہیں، طاقت کا ہے'' اپنے مثبت ردعمل کے باعث بے حد پسند آیا۔ آپ نے لاگ لپیٹ کے بغیر باتیں اس مضمون میں کہی ہیں۔ ان میں غصہ تو جھلکتا ہے لیکن آپ کے بیانات معقول اور مدلل ہیں۔ جواب کو بالکل اسی انداز میں ہونا چاہئے تھا۔ ہماری اردو یا ہماری ہند اسلامی تہذیب کو جانے بغیر کوئی بھی، کبھی بھی، کچھ بھی لکھ دیتا ہے اور ہم خاموش رہتے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ میں ان ادب دوست بھائیوں کی بھی تعریف کرتی ہوں جنھوں نے راجندر صاحب کا مضمون آپ کو پڑھ کر سنایا اور اس کے بارے میں آپ کا بیان ریکارڈ کیا، نہ صرف یہ کہ ریکارڈ کیا بلکہ ''جن مت'' میں اسے من وعن چھاپا بھی۔

الہ آباد — تسنیم کوثر

❁ آپ کے جواب سے راجندر یادو کے مضمون کا متن پنہاں عیاں ہو جاتا ہے اور ان کی فرسودہ عالمانہ فرقہ واریت تمسخر بن کر سامنے آتی ہے۔ آپ کے انداز تکلم نے راجندر یادو کی صحیح روحانی غیر مرئی صورت سامنے رکھ دی ہے۔

حیدرآباد — اقبال متین

❁ تہذیبوں کا ٹکراؤ والا معاملہ کچھ زیادہ نکیلا ہو گیا ہے۔ لیکن ایسے جواب کی تقریباً ضرورت تو تھی ہی۔ آپ نے اچھا کیا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے دیا۔ عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس طرف ہمارے دانشوروں کا دھیان کیوں نہیں گیا۔ اکثر نکتے جو آپ نے بیان کئے ہیں برمحل ہیں۔

ہندوستان و پاکستان میں ککرمتے کی طرح اگنے والی شاعری پر جوثر ایاغ نے بھی خامہ فرسائی نہیں کی۔ انھیں عالم خورشید اور نعمان شوق ہی نظر آتے ہیں، یہاں بھی معاملہ غریب کی جورو والا ہے۔ آپ نے ان شاعروں کی وکالت کی مجھے بہت اچھا لگا۔ ل۔ احمد اکبرآبادی کی گفتگو بڑے معرکے کی ہے۔ پسند آئی، اس سلسلے کو جاری رکھیں کہ ہمارے علم میں اضافہ ہوتا رہے۔

گیا — شاہد اختر

❁ ''شب خون'' ۲۶۹ نفیس اور دیدہ زیب اور بڑی حد تک سہو

(۱) جی نہیں، یہ ادارتی املا ہے۔ ''نا'' غیر ضروری اور قدیمی املا ہے (ادارہ)۔

www.taemeernews.com

کتابت سے پاک ہے۔ حصہ نظم ونثر دونوں متاثر کن ہیں۔ غلام مصطفی فراز کی غزلوں کو آپ کی نگاہ توجہ نے تنویر اور درخشانی عطا کی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جدیدیت کا پرچم سرنگوں ہو۔ کوئی بھی نقش اسی وقت کوتاہ قامت ہوتا ہے جب اس سے بلند تر نقش وجود میں آجائے، اور جدیدیت سے بلند تر نقش ابھی تک تو قرطاس ادب پر وجود پذیر ہوا نہیں۔

''ٹکراؤ تہذیبوں کا نہیں، طاقت کا ہے'' ایک تھپڑ ہے ان اردو دشمن عناصر کے منہ پر جو ہند اسلامی تہذیب اور اردو زبان کے نکتہ چیں ہیں۔ آپ نے اپنی تحریر میں کمیونسٹوں کی بھی خوب خبر لی ہے جنھوں نے کئی نسلوں کو گمراہ کیا اور بعد میں ان کا یہ حال ہوا کہ لینن اور اسٹالن کے مجسموں کو انھیں کے عوام نے توڑ پھینکا۔ اردو زبان کو مسخ کرنے کی کوشش ترقی پسندوں نے بھی کی تھی۔ اب یہ نئی بات شروع ہوئی ہے کہ یاروں نے اردو کو بہ طرز ہندی لکھنا شروع کیا اور اردو کے اچھے الفاظ کو ترک کرکے ٹھیٹھ ہندی کے الفاظ اردو رسم الخط میں لکھنے لگے۔ اور یہ سب کچھ کسی مجبوری کے تحت نہیں کہ اردو کے پاس ان کا متبادل نہیں ہے، بلکہ ایک سازش کے تحت ہے۔ آپ کی جرأت اظہار کی تقلید ہونی چاہئے۔

''شب خون'' میں شائع ہونے والے افسانے منفرد لسانی ندرت کا نمونہ تو ہوتے ہی ہیں، لیکن مجھے عبدالصمد کی کہانی پڑھ کر حیرت ہوئی۔ وہ ان دنوں اس طرح سے تو نہیں لکھ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ارادتاً انھوں نے یہ کہانی ''شب خون'' کے لئے لکھی ہے اور یہ طرز اختیار کیا ہے۔ بہر حال یہ طرز خوش کن ہے ورنہ ان کی دیگر تحریریں تو زیادہ تر سپاٹ اور بے رس ہوتی ہیں۔ مگر یہ دو طرح کی تحریریں لکھنے کا کیا مقصد ہے؟ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں آخر؟ اس معاملہ میں شفق کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کس قدر خوبصورت فکشن لکھتا تھا یہ شخص، مگر اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ رومانی ناول لکھنا شروع کر دیئے ورنہ اس کے یہاں جدید حسیت کا کس قدر اعلیٰ بیان ہوتا تھا۔ تعریف کے قابل ہیں مظہر الزماں خاں اور حسین الحق، اور ان جیسے دوسرے قلم کار جنھوں نے جدیدیت کے مزاج کو سمجھا اور اپنی جڑوں سے وابستہ رہے اور سیاسی لوگوں کی طرح پٹری بدلنے کو مذموم قرار دیتے رہے۔

تازہ ''شب خون'' میں سعید اختر درانی کی نظم ''اسفل سافلین'' بھی دلچسپ ہے۔ غلام حسین ساجد، افضال نوید، حمایت علی شاعر، بشر نواز خوب ہیں۔ لیکن سب سے اہم تخلیق ادونس کی ''عصر حاضر کا نوحہ'' ہے۔

کانپور
عشرت ظفر

❁ ''شب خون'' کے باب مراسلات میں شمیم حنفی کے بارے میں عتیق اللہ کی چار سطری عبارت نہ صرف نامناسب ہے بلکہ اس سے بغض وعناد کی بھی بو آتی ہے۔ نہ جانے کس خوش فہمی کا شکار ہو کر موصوف شمیم حنفی کو بحیثیت نقاد اپنا حریف تصور کر بیٹھے ہیں اور کہیں گہرائی میں چھپے احساس کمتری کے باعث ایسی بے جا لفاظی پر اتر آئے ہیں۔ اردو والے اب اتنے غافل بھی نہیں کہ شمیم حنفی اور عتیق اللہ میں فرق نہ کر سکیں۔ شمیم حنفی تو ایسے موقعوں پر خاموش رہتے ہیں شاید اس لئے کہ وہ بے اعتمادی کا شکار نہیں ہیں۔ مگر ان کی صلاحیتوں کے معترف لوگ ان کے بارے میں بے جا اور نامناسب ایراد کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

حیدرآباد
سید خالد قادری

❁ تازہ شمارے میں جوثر ایاغ کے خط پر نوٹ لگاتے ہوئے آپ نے لکھا ہے'' ہمارے یہاں کلام کی اشاعت میں تاخیر مجبوراً ہو سکتی ہے۔ ارادی طور پر نہیں۔'' عرض ہے کہ آپ نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ آپ اشاعت کے سلسلے میں خط لکھتے ہیں اور پھر اسے کبھی بھی شائع نہیں کرتے۔ اس کا ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے شاعر کا بچاؤ کرتے ہوئے لکھا ہے ''مراسلہ نگار نے استعارے کی جہتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔'' بھائی میرے اس طرح ایک سطر لکھ دینے سے کام نہیں بنتا۔ ضروری تھا کہ آپ اس سلسلے میں ذرا تفصیل سے لکھتے۔

''بازار'' پر کافی محنت صرف کی گئی ہے۔ مگر اسے یا تو عبدالصمد ہی سمجھ سکتے ہیں یا شمس الرحمٰن فاروقی، یا پھر وہ قاری جو بغیر سمجھے تعریفی خطوط لکھنے کے عادی ہیں۔ ابرار احمد کی شروع کی تین غزلیں تو بہت سستی ہیں (ممکن ہے آپ کے لئے معیاری ہوں)، انھیں پڑھ کر شکیل بدایونی کا فلمی شعر یاد آتا ہے۔ آپ جیسا آدمی تو اس میں بھی استعارہ اور علامت ڈھونڈ نکالے گا۔ یہی تو آپ کی شعر فہمی ہے۔ میں ایک جاہل آدمی کیا سمجھ سکتا ہوں۔ بہر حال، رسالہ آپ کا، جو چاہے چھاپئے اور جسے چاہئے چھاپئے۔

بھاگل پور
ظفر احمد

❁ مسعود اشعر کا افسانہ ''اپنا گھر''، نام نہاد سیکولرسٹ راجندر یادو کو آپ کا جواب، ''ٹکراؤ تہذیبوں کا...'' منیر نیازی کی نظمیں اور حافظ شمس کی ل۔ احمد اکبر آبادی سے ایک گفتگو تخلیقات قابل قدر ہیں۔ اس انٹرویو کو شائع کر کے آپ نے ایک بار پھر زبان کی صحت اور معیار کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

مونگیر
شبیر حسن

❁ مسعود اشعر کا افسانہ ''اپنا گھر'' بلند پایہ اور موثر افسانہ ہے۔ پڑھتے ہوئے کئی بار گلا رندھ گیا، کسی جگہ آنکھ نم ہوئی اور کہیں دل بھر آیا۔ اختتام پر تو یوں لگا کہ بھیگی آنکھوں کے آگے پلکوں کی باڑ ڈھ جائے گی۔ عمدہ، مکمل، معیاری، بھرپور، اور فنی لحاظ سے متوازن افسانہ ہے۔ راوی نے کہیں جانب داری کا اظہار نہیں کیا۔ محرومی وجلاوطنی کے انسانی جذبات، یاس انگیزی، اور غم و اندوہ کی فہم میں افسانہ نگار کو کمال حاصل ہے۔

''ٹکراؤ تہذیبوں کا نہیں...'' پڑھ کر معلوم ہوا کہ کبھی کبھی آپ زبان سے صرف نظر بھی کرتے ہیں۔

بریڈ فورڈ
مقصود الٰہی شیخ

❁ ''شب خون' جدید شعر وادب کا منہ بولتا آئینہ ہے۔ انتظار حسین کا مضمون ''رزمیے میں ایک نئی جہت''، معراج رعنا کا مضمون ''کلام متکلم اور معنیات کی تشکیل'' ادب میں بے بہا اضافہ ہیں۔ کلام میں متکلم کی حیثیت اور شعری معنوی تشکیل کے حوالے سے نثری اور شعری کلام کی ہر شاخ سے خلاقانہ بحث کی گئی ہے۔

www.taemeernews.com

افسانوں میں ''سائے'' اور ''دوسری موت'' پسند آئے۔ غزلوں اور نظموں کے صفحات شاہکار کی حیثیت سے ہیں۔ احمد مشتاق، عذرا عباس کی نظم ''لفظوں کا زوال''، یاسمین حمید کی نظمیں ''ہمارے منصب میں''، ''ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے''، کاوش بدری، عشرت ظفر اور خصوصاً شاہین کی غزلوں نے بے حد متاثر کیا۔ اسما راجہ کی نظم ''خدا کے بغیر ایک دن'' اور ناہید اختر کی نظم اور ترجمے کے مسائل پر گفتگو نے شمارے کی اہمیت کو دو چند کر دیا ہے۔

جمشید پور — رضوانہ پروین ارم

❁ شمارہ ۲۶۹ بے حد پسند آیا، شکریہ ادا کرنا واجب ہو گیا۔ میں منیر نیازی کو فی الحال اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔ ان کی دونوں نظمیں مجھے ہارڈی کی یاد دلاتی ہیں۔ غلام حسین ساجد اعلیٰ غزل گو ہیں۔ مدحت الاختر اچھا کہتے ہیں لیکن بسیار گوئی گاہے گاہے خشک بنانے لگتی ہے۔ بیدار بخت کی نظمیں پہلی بار دیکھیں۔ مسعود اشعر کے افسانے کا جواب نہیں۔ عبد الصمد کو فکشن نگاری پر عبور حاصل ہے۔ آپ کے مضمون کا ترجمہ حسب معمول عمدہ ہے۔ ہندی زبان بعد آزادی قابل رشک طور پر ترقی پذیر ہوئی صحافت ہو یا ادب دونوں میدانوں میں اردو رفارسی رعربی الفاظ اس کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ بڑی زبان کی یہ خصوصیت ہے۔ ان کے یہاں رفتہ رفتہ اردو سے جلن اور بے گانگی کا جوش کم ہو رہا ہے۔

آپ نے سارا برن ہارٹ کا ذکر خوب کیا۔ ایسے اچھے شمارے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

کولکتہ — حبیب حق

❁ یہ ذکیہ مشہدی کون ہیں؟ کیا خوبصورت افسانہ انھوں نے لکھا ہے۔ ہیں تو مشہدی لیکن ایسی خوبصورت ہندی آمیز زبان لکھی ہے کہ داد دینی پڑتی ہے۔ پھر فارسی سے بھی کوئی پرہیز نہیں۔ اردو کی تو اصل خوبی یہی ہے کہ اس میں فارسی ہو کہ عربی کہ ہندی یہاں تک کہ انگریزی سب کھپ جاتی ہیں۔

حیدر آباد — سید سراج الدین

❁ آپ جس پابندی سے ''شب خون'' شائع کر رہے ہیں اس نے ضرور کچھ ایسے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا ہوگا جو اس سے ایک زمانے تک وابستہ رہے اور پھر انھوں نے آپ سے الگ ہو کر اپنی دوکان الگ کھولی۔ ان لوگوں کا خیال رہا ہوگا کہ ان کی عدم موجودگی میں آپ ''شب خون'' نکال نہ سکیں گے اور بہت جلد یہ رسالہ بند ہو جائے گا لیکن آپ نے اس کی رفتار میں مزید تیزی پیدا کر کے سب کا منہ بند کر دیا، رسالہ بہر حال بند نہ ہوا۔

''شب خون'' جدیدیت کا علم بردار ہے اور اس رسالے کے ذریعہ جدیدیت کی شناخت اور شعریات مرتب ہوئی۔ لیکن آج کل بعض تحریروں میں ''مابعد جدیدیت'' کی حمایت جس انداز میں کی جا رہی ہے وہ مضحکہ خیز ہے۔ ''مابعد جدیدیت'' کی تعریف میں جو مضامین شائع ہو رہے ہیں وہ دلائل سے خالی اور حد درجہ جذباتیت کا شکار ہوتے ہیں لہٰذا ایسی صورت میں کوئی قاری ان کا جواب لکھے تو کیسے لکھے اور کیوں لکھے؟ ان مضامین کی نوعیت کچھ ایسی ہے گویا میں کہوں غالب سے کئی گنا بڑے شاعر دل لکھنوی ہیں۔ آپ اسے ایک لطیفہ ہی خیال کریں گے۔ ''مابعد جدیدیت'' کا شور تو ہر طرف ہے مگر کیا کہیں اس نام کی کوئی شے موجود بھی ہے؟

بنارس — عارف ہندی

❁ مسعود اشعر کا افسانہ ''اپنا گھر'' دل کی گہرائیوں کو چھو گیا۔ تقسیم کے موضوع پر اتنا لکھا گیا ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد شائع ہونے والے افسانوں کا شاید ہی کوئی مجموعہ اس سے خالی ہو۔ لیکن تقسیم کا درد اتنا شدید ہے کہ اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ اس درد کی شدت کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ دل غمگین ہو ہی جاتا ہے، آنکھیں نم ہو ہی جاتی ہیں۔ مسعود اشعر کے افسانے میں ماضی کا درد حال کے درد میں مدغم ہو کر نئی کیفیت پیدا کرتا ہے۔

آپ نے راجندر یادو کے جواب میں بہت کھل کر، اور بہت صحیح باتیں کہیں۔ آپ کی گفتگو میں ان تمام لوگوں کی باتیں شامل ہیں جو دل ہی دل میں گھٹتے رہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پاتے ہیں۔ اطہر فاروقی کی یہ بات بھی سچی ہے کہ اردو بنام ہندی کی لڑائی میں گیان چند صاحب ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ کھڑے دکھائی دیے ہیں جن کو اردو قبول نہیں تھی۔ عتیق اللہ صاحب اپنی نا قابلیت کا رعب شمیم حنفی پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ بڑا افسوس ہوا۔ میرے خیال میں عتیق اللہ صاحب کی تحریر ابھی اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ کسی معتبر نقاد کے حوالے میں آسکے۔

اودے پور — شاہد عزیز

❁ کیا وجہ ہے کہ ''شب خون'' میں غزلیں اور نظمیں زیادہ ہوتی ہیں، نقد و نظر اور افسانے کم ہوتے ہیں؟ محض شاعری تو اردو ادب نہیں؟ میرے خیال **میں انتقاد، افسانے اور دوسرے موضوعات کے لئے ''شب خون'' کے مزید صفحات مختص کئے جانے چاہئے۔**

مدنا پور — محمد سیف عالم شاہین

❁ ''شب خون'' ۲۶۸ میں ڈاکٹر اطہر فاروقی صاحب کا مکتوب گرامی نظر سے گذرا۔ اس خط کی ایک نقل وہ مجھے پیشگی بھیج چکے ہیں۔ میرا جواب خاموشی تھا مگر اشاعت کے بعد سوچا اس طرح اس ادارے پر حرف نہ آجائے جہاں سے وہ پی۔ ایچ ڈی کر کے نکلے ہیں لہٰذا کچھ نہ کچھ کہنا لازم ہے۔

جس ''پینٹھ'' میں مجھے ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا اس کا قصہ یوں ہے کہ موصوف مذکورہ سیمینار کے پہلے مقرر تھے اور جیسے ہی انھوں نے اپنے مقتدر مقالے کا پہلا صفحہ کھولا، اسٹیج سے کہا گیا کہ وقت مختصر ہے دو تین منٹ میں بات ختم کی جائے۔ اب ڈاکٹر صاحب جھلا گئے (شاید یہ سخت لفظ ہے، گھبرا گئے)۔ غالب کی زبان میں میری جو شامت آئی، میں نے وقفے میں موصوف سے مل کر اپنا تعارف کرایا اور ظاہر ہے تسلی دلاسا دیا۔ آپ دلی سے آئے تھے۔ دلی میری ننھیال ہے، میں اس شہر سے اک گونہ تعلق خاطر رکھتا ہوں۔ ''مخزن'' کا ایک نسخہ بھی انھیں پیش کیا۔ کچھ عرصہ بعد (حسب وعدہ) ان کی طرف سے ڈاکٹر ذاکر حسین اسٹڈی سرکل کے سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ میرے لئے بڑی بات تھی۔

www.taemeernews.com

اس سے بھی بڑی بات یہ معلوم ہوئی کہ جن لوگوں نے موصوف کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا تھا، ان میں سے بھی کئی کو آنے جانے کا کرایہ دے کر مدعو کیا گیا تھا۔ یہ ان کے وہی دوست تھے جن کو اب ڈاکٹر اطہر فاروقی ''برطانوی حکومت سے خاصی بڑی رقم لے کر اردو کے نام پر چلنے والے ٹرسٹ کے متولی'' بتا رہے ہیں۔ میں سخت خلجان میں ہوں کہ میرا انھوں نے، اپنے ان کرم فرماؤں سے جھوٹوں ہی کوئی رشتہ نہیں جوڑا۔ اگر نشانہ وہ ہیں تو مجھ پر تیر اندازی کیسی؟

میں سمجھتا ہوں کہ موصوف ''شب خون'' میں ایک بحث چھیڑنا چاہتے ہیں اور مجھ کو غریب جان کے اور پچھتم کا ساکن سمجھ کر اشتعال دلا کر کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، مگر وہ یہ بھول رہے ہیں کہ موضوع کو متنازعات کے ذیل میں یوں نہیں لایا جاتا۔ اس طرح تو بات اصل موضوع سے ہٹ کر فروعات بلکہ خرافات میں ''پڑ'' جاتی ہے۔

اس سے پہلے کہ میں ''شب خون'' کے پڑھنے والوں کی توجہ اصل بات کی طرف مبذول کراؤں، ڈاکٹر اطہر فاروقی کی ہائیڈ پارک سے وابستہ یادوں کے بارے میں اشارہ کردوں۔ میں اس ملک میں پورے اکتالیس سال سے رہ رہا ہوں۔ میں کوئی دعویٰ نہیں رکھتا کہ میں ہائیڈ پارک کے ان تمام کونوں اور گوشوں میں جھانک آیا ہوں جہاں اطہر فاروقی صاحب نے ''۱۹۹۳ سے اب تک خاصا وقت آوارگی کرتے گذارا ہے۔'' جنریشن گیپ، اور جانے کیا کیا، راہ میں ہوگا۔

مجھے اقرار ہے کہ میں ''اردو کی بپتا'' (مطبوعہ ''شب خون'' ۲۶۱) لکھنے کا گناہگار ہوں۔ یہ وہی مضمون ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر اطہر فاروقی نے ''شب خون'' کے ایڈیٹر سے پوچھا تھا کہ انھوں نے اسے (آخر) کیوں چھاپا؟ اس ''کیوں'' کا جواب مجھ پر واجب نہیں، لیکن لکھنے کے جرم کی وضاحت کرسکتا ہوں۔ اطہر فاروقی کا خیال ہے ''علمی مضمون لکھنے کے لئے جس طرح کی علمی تربیت، مطالعہ اور تجزیے کی صلاحیت چاہیے؛'' وہ مجھ میں نہیں۔ جناب میں تو اردو سے محبت کا عادی مجرم ہوں۔ کسی ڈیسک پر بیٹھ کر دوسروں کے جمع کردہ اعداد و شمار اور حوالوں سے تہی دامن ہوں۔ گلی گلیاروں میں پھر کر اردو کا دم بھرنے والے کی حیثیت سے، اپنے مشاہدے اور تجربے پر مبنی مہم میں، اگر میں اپنے دوستوں کی مدد سے کسی جگہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ اردو، ہندی کی کلاسیں الگ الگ ہونی چاہئیں اور اس کے لئے اتالیق کا تقرر بھی جدا جدا ہو، تو ایسا کرنے میں مجھے کوئی نقصان اردو یا ہندی کا نظر نہ آیا تھا۔ بھائی، اگر میں اس کا اہل نہیں تو وہ یہ کام خود سنبھال لیں، مجھے تو اردو والے ایک چھوٹا موٹا افسانہ نگار ہی تسلیم کرلیں تو میں خوش میرا خدا خوش ——— اردو پر مضمون لکھ کر ''اپنے کو رہنما کے طور پر پیش کرنے کا بہانہ تلاش کرنا'' میرا منشا ہر گز نہیں تھا۔ کیا انھوں نے میرا دوسرا مضمون ''اردو رانی، امر کہانی'' جو ہندوستان میں کئی جگہ چھپا، ملاحظہ نہیں کیا؟ میں اس مضمون میں کہہ چکا ہوں میرا تعلق تعلیم، تدریس، تحقیق سے ہے نہ میں کوئی ماہر لسانیات ہوں۔ صرف اردو کا دیوانہ ہوں اور اسی پر مجھے فخر ہے۔ اپنی ڈگری اور ڈاکٹر ذاکر حسین اسٹڈی سرکل کا سکریٹری ہونے کا تفاخر آپ کو مبارک۔

اگست ۲۰۰۳ ۲/۱/۷۲

بریڈفورڈ
مقصود الٰہی شیخ

❁ ''شب خون'' شمارہ ۲۶۹ میں جناب اطہر فاروقی کا مضمون نہ صرف یہ کہ حقائق کے بالکل برعکس ہے بلکہ ان کا انداز گفتگو بھی کچھ ایسا ہے کہ بقول غالب انھی سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے ع

تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

۲۰۰۱ میں اردو ٹرسٹ کے جس سیمینار میں اطہر فاروقی صاحب نے شرکت کی تھی اس کو اگر وہ پینٹھ سے تعبیر کرتے ہیں تو پھر یہ بتانے کی بھی زحمت کریں کہ انھوں نے اس پینٹھ کے لئے ٹرسٹ کے خرچ پر سفر اور قیام کیوں کیا؟ جو انداز گفتگو ''شب خون'' کے خط میں ہے ایسا ہی شدت پسندانہ رویہ انھوں نے اردو ٹرسٹ کے جلسے میں اسٹیج پر اس وقت اختیار کیا جب ان سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ اپنے مقالے کی تلخیص دس منٹ میں پیش فرمادیں۔ اگر بہت مہذب لہجہ اختیار کیا جائے تو بھی فاروقی صاحب کے لہجے میں جو حقارت برطانیہ میں آباد اردو اہل قلم اور خود سیمینار کے میزبانوں کے لئے تھی، اس کے لئے بے ادبی کے سوا کوئی اور لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

اردو ٹرسٹ برطانوی قانون کے مطابق، چیریٹی کمشنر کے دفاتر میں رجسٹرڈ ادارہ ہے۔ ٹرسٹ کے بانی حیاتی اراکین میں اس کے سکریٹری جنرل جناب صابر ارشاد عثمانی یونیسکو (UNESCO) کے برطانوی دفتر میں اہم عہدے پر فائز تھے۔ دوسرے رکن جناب پروفیسر عبدالغفار عزم مشہور زمانہ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز (SOAS) میں انٹرنیشنل لا کے پروفیسر تھے۔ تیسرے رکن خواجہ طارق محمود اردو شاعری کے مشہور انگریزی مترجم ہیں۔ ٹرسٹ کے چوتھے رکن افتخار عارف سابق اردو مرکز کے بانیان میں سے تھے۔ افتخار عارف کی شہرت ان کی شاعری کی وجہ سے ہے مگر سلیم قریشی اپنی منکسر المزاجی کی وجہ سے زیادہ نہیں جانے جاتے۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا ایسے مقتدر حضرات کے قائم کردہ ادارے، جسے برطانوی حکومت مستقل گرانٹ دیتی ہے، جسے اس نے لندن کے انتہائی مہنگے علاقے میں ایک دفتر بھی دے رکھا ہے اور اب جو سارے یورپ کے اردو اہل قلم کا واحد فعال ادارہ ہے، اس کے ترتیب دادہ جلسے کو پینٹھ کہنا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟

اردو ٹرسٹ سے فاروقی صاحب کی ناراضگی کی اصل وجہ شاید یہ ہے کہ اس پر کمیونسٹوں کا غلبہ نہیں اور لندن کی ہر محفل میں اطہر فاروقی صاحب ہمیشہ فخریہ انداز میں یہ کہتے پائے گئے کہ وہ مارکسسٹ ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اطہر فاروقی صاحب کا یہ خط ''شب خون'' میں شائع ہوا جس کے مدیر نے ترقی پسندوں کے تمام بت مسمار کیے۔

آخر میں اطہر فاروقی صاحب سے مودبانہ طور پر یہ معلوم کرنا ہے کہ برطانیہ کے جن اہل قلم حضرات کو وہ نرا جاہل گردانتے ہیں انھیں اطہر فاروقی صاحب نے خود اپنے سیمینار میں کیوں مدعو کیا؟

لندن
سید محمد عاقل کیف سرونجی

www.taemeernews.com

❁ اس سال کا گیان پیٹھ ایوارڈ گجراتی کے مشہور ادیب اور شاعر راجیندر لال شاہ (پیدائش ۱۹۱۳) کو ملا ہے۔ نوے سالہ راجندر لال شاہ کی شاعری حسن کے بیان اور پرستش سے عبارت کہی گئی ہے۔ انھوں نے ٹیگور، ودیاپتی، قاضی نذرالاسلام، اور برج بھاشا کے شعرا کا بھی اثر قبول کیا ہے۔ ہم انھیں مبارک باد دیتے ہیں۔

❁ مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے عابد سہیل (''فکشن کی تنقید'' تنقیدی مضامین)، مظہر امام (''پالکی کہکشاں کی''، مجموعہ کلام)، اور رونق نعیم (''تنہا اداس جنگل''، مجموعہ کلام) کو پانچ پانچ ہزار روپئے کے انعامات دیئے ہیں۔ ان کے علاوہ، تین ہزار روپئے کا ایک انعام مشتاق اعظمی کو دیا ہے۔ ہم انعام یافتگان کو مبارک باد دیتے ہیں لیکن یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انعامات کی رقم اتنی کم رکھنے میں کیا مصالح ہیں۔ جب یہ انعامات قائم کئے گئے تھے اس وقت یہ رقوم شاید کچھ معنی رکھتی ہوں، لیکن اب تو مالی اعتبار سے تقریباً بے معنی ہیں۔

❁ گذشتہ دنوں ہندی کے مشہور فکشن نگار بھیشم ساہنی کا انتقال ہو گیا۔ وہ چوراسی برس کے تھے۔ ان کے آخری زمانے کی تحریروں میں ''تمس'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ بھیشم ساہنی نے ہندی ادب میں ترقی پسندی کو قائم ورائج کرنے میں تاریخی کردار ادا کیا تھا۔ اس کے علاوہ، ۱۹۹۲ کے حادثات کے بعد انھوں نے سربرآوردہ ادیبوں کی خودنوشت تحریریں جمع کر کے ''سہمت'' کے زیر اہتمام ایک ہندوستان گیر نمائش قائم کی تھی۔ ان کی موت ہندوستانی ادب کے لئے بہت بڑا نقصان ہے۔

ادارہ مرنے والے کے غم میں سوگوار ہے اور ان کے لئے دعائے خیر کرتا ہے۔

❁ شمارہ ۲۶۷ میں ہم نے انگلستان کے ملک الشعرا اینڈرو موشن کی نظم Regime Change کا ترجمہ شائع کیا تھا (مترجم، مہر افشاں فاروقی)۔ لندن سے عدیل یوسف صدیقی نے ہمیں مشہور برطانوی اخبار Daily Telegraph کا تراشہ بھیجا ہے جس میں اخبار کے Arts Correspondent نائجل رینالڈس (Nigel Reynolds) نے اطلاع دی ہے کہ موشن کی نظم کو بعض بااثر انگریزوں نے ''وطن دشمن'' قرار دیا۔ موشن نے اس پر جواب دیا کہ میرے خیال میں میری نظم جنگ کی سخت مخالفت پر بیشک مبنی ہے، لیکن وطن دشمن نہیں ہے۔ سابق وزیر تعلیم لارڈ بیکر صاحب نے بھنا کر فرمایا کہ جنگ کی بہترین شاعری ان لوگوں نے لکھی ہے جو خود شریک جنگ تھے، نہ کہ انھوں نے جو ساحل سے رزم کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ عظیم شاعر ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس (W. B. Yeats) نے ایک نظم میں کہا تھا کہ ''شاعر کے پاس ایسی کوئی صلاحیت نہیں کہ وہ سیاست داں (Statesman) کو ٹھیک بنا سکے۔'' موشن نے کہا یہ خیال لغو ہے کہ میری نظم ''ملک الشعرائی کی روح کے منافی'' تھی۔

❁ **اقبال مجید** نے یہ مضمون دہلی کے ایک سیمینار میں پڑھا تھا۔ ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ جلد شائع ہونے والا ہے۔

❁ ہندی کی مشہور ادبی انجمن ''پریمل'' [Parimal، اس لفظ کے معنی ہیں ''خوشبو''] کئی معنی میں اردو کے حلقہ ارباب ذوق سے مشابہت رکھتی ہے۔ ہندی کے مشہور ادیب اور شاعر **بشن ٹنڈن** اس انجمن کے بانیوں میں تھے۔ بشن ٹنڈن ایک مدت تک اندرا گاندھی کے زمانے میں وزیر اعظم کے دفتر میں جوائنٹ سکریٹری رہے۔ اس زمانے کی یادداشتوں پر مشتمل ان کی ضخیم کتاب P. M. O. Days, Prelude to Emergency کچھ دن ہوئے ہندی اور انگریزی میں منظر عام پر آئی ہے اور علمی اور سیاسی حلقوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

❁ **رشید الدین** نے ایک مدت تک خلیجی ممالک میں صحافی کے طور پر کام کیا۔ اب وہ ہندوستان واپس آ کر ''منصف'' حیدر آباد اور بعض دوسرے اخباروں سے منسلک ہو گئے ہیں۔

❁ **سید محمد اشرف** ان دنوں علی گڈھ میں انکم ٹیکس کمشنر کی حیثیت سے تعینات ہیں۔ ان کی یہ تحریر زیر تکمیل ناول ''مردار خوار'' کے چند ابواب پر مشتمل ہے۔

❁ **مقصود الٰہی شیخ** گذشتہ دنوں گھٹنوں پر عمل جراحی سے گذرے تھے۔ اب وہ صحت یاب ہو رہے ہیں۔

❁ **نیر مسعود** کی تازہ کتاب ''حیات انیس'' کچھ دن ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو نے شائع کی ہے۔ یہ کتاب پاکستان میں بھی جلد شائع ہونے والی ہے۔

اپنی کتابوں کی اعلیٰ طباعت کے لئے ہماری
خدمات سے فائدہ اٹھائیں
امین اختر
معرفت شب خون کتاب گھر،
الہ آباد

www.taemeernews.com

کتابیں جو زندگی کا سرمایہ ہیں

"آج" اجمل کمال شمارہ ۳۰،۳۱،۳۳،۳۴،۳۵،۳۶،۳۹،۴۰ فی شمارہ ۱۰۰ روپے
آصف فرخی دنیازاد۔۶ ۲۵۰ روپے
احمد زین الدین روشنائی۔۱۳ ۷۵ روپے
اختر یوسف جلتا ہوا سیارہ (افسانے) ۱۴۰ روپے
اسد محمد خاں نربدا اور دوسری کہانیاں ۱۸۰ روپے
اظہار الاسلام واپسی (افسانے) ۱۵۰ روپے
افضل احسن رندھاوا دیا اور دریا (ناول) ترجمہ زاہد حسین ۶۰ روپے
امیر حسن اک الف بیش (مجموعۂ کلام) ۲۰۰ روپے
انتظار حسین شہزاد کے نام ۲۱۸ روپے
انور سین رائے چیخ (ناول) ۷۵ روپے
انور شعور اندوختہ (مجموعۂ کلام) ۲۰۰ روپے
جلیس نجیب آبادی تذکرۂ سیدنا یوسف ۱۰۰ روپے
جون ایلیا یعنی ۱۵۰ روپے
حسن منظر ایک اور آدمی (افسانے) ۸۵ روپے
حنیف ترین زمین لاپتہ رہی (مجموعۂ کلام) ۱۵۰ روپے
خالد حسن قرۃ العین حیدر کے خطوط ایک دوست کے نام ۲۲۵ روپے
ذی شان ساحل ای میل اور دوسری نظمیں ۱۰۰ روپے
ذی شان ساحل شب نامہ ۱۵۰ روپے
ذی شان ساحل کراچی اور دوسری نظمیں ۱۰۰ روپے
ساقی فاروقی A Listening Game دوسرا ایڈیشن ۱۰۰ روپے
(منتخب کلام کا انگریزی ترجمہ مع دیباچہ از شمس الرحمٰن فاروقی)
سید امین اشرف جادۂ شب (مجموعۂ کلام) ۱۰۰ روپے
سید رفیق حسین آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں ۳۷۵ روپے
شاہدہ حسن یہاں کچھ پھول رکھے ہیں (مجموعۂ کلام) ۱۵۰ روپے
شاہ حسین نہری شب تاب ۱۰۰ روپے
شفق سوپوری موسیقی، شاعری اور لسانیات ۱۰۰ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی سوار ۲۰۰ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی اردو کا ابتدائی زمانہ ۱۲۰ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی عروض، آہنگ اور بیان ۷۵ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی ساحری، شاعری، صاحب قرانی ۱۸۰ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی شعر شور انگیز جلد ۱ تا ۴ ۶۰۰ روپے

شمس الرحمٰن فاروقی غالب پر چار تحریریں ۱۰۰ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی لغات روزمرہ ۲۰۰ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی اور فرانسس پرچیٹ ترجمہ آب حیات ۲۵۰ روپے
صبا اکرام جدید افسانہ، چند صورتیں ۱۵۰ روپے
ضمیر نیازی زمین کا نوحہ ۲۰۰ روپے
عادل منصوری حشر کی صبح درخشاں ہو (مجموعۂ کلام) ۲۰۰ روپے
عذرا عباس راستے مجھے بلاتے ہیں ۷۰ روپے
غلام مرتضیٰ راہی لاکلام (مجموعۂ کلام) ۱۲۵ روپے
فاطمہ حسن کہانیاں گم ہو جاتی ہیں (افسانے) ۱۵۰ روپے
فرید پربتی آب نیساں (مجموعۂ کلام) ۱۵۰ روپے
فہمیدہ ریاض آدمی کی زندگی (مجموعۂ کلام) ۷۰ روپے
قرۃ العین حیدر دامانِ باغباں (مجموعۂ خطوط) ۵۰۰ روپے
کبیر داس ترجمہ و حواشی سردار جعفری ۲۰۰ روپے
لالی چودھری حد چاہیے سزا میں.... (کہانیاں) ۱۷۵ روپے
محمد حسن عسکری مقالات محمد حسن عسکری ۲ جلد ۶۰۰ روپے
میراجی اس نظم میں ۲۸۲ روپے
محمد علوی چوتھا آسمان ۵۰ روپے
مکالمہ شمارہ ۷ مدیر: مبین مرزا ۱۵۰ روپے
معصوم نظر حرف اول (مجموعۂ کلام) ۱۵۰ روپے
مغنی تبسم مٹی مٹی میرا دل ۱۰۰ روپے
من موہن تلخ لاپتہ ۱۵۰ روپے
من موہن تلخ وسیلہ ۱۵۰ روپے
ندا فاضلی دیواروں کے بیچ ۱۵۰ روپے
نصیر احمد ناصر عراب جی سو گیا ہے ۱۵۰ روپے
نصیر احمد ناصر پانی میں گم خواب (شعری مجموعہ) ۱۵۰ روپے
نشاط فاطمہ جدید اردو تنقید ۱۴۰ روپے
ن۔م۔راشد کلیات راشد ۴۰۰ روپے
نیر مسعود طاؤس چمن کی مینا ۱۷۵ روپے
ولی رام ولبھ ترجمہ بشیر عنوان، زندگی سے کٹا ہوا ٹکڑا ۶۰ روپے
ہمدم کاشمیری دھوپ لہو کی (غزلیات) ۱۰۰ روپے

شب خون کتاب گھر سے طلب کریں

www.taemeernews.com

Regd. with the Registrar of Newspapers No. 12476/66

Issue No. 271
August, 2003

Urdu Monthly
Shabkhoon
P.O. Box No. 13
313, RANI MANDI,
ALLAHABAD-211003

Postal Regd. No. PMG-AD/117
2003-2005

LICENSED TO POST WITHOUT PRE-PAYMENT
Lic. No. WP-1 Dtd. 15-6-2001

Price per copy Rs. 24/-

ممالک غیر میں شب خون

ممالک غیر کے شائقین ''شب خون'' حسب ذیل پتوں پر رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ پتوں کے آگے صراحت کردہ زر تعاون ارسال کر کے ہمیں مطلع کر دیں۔ اطلاع ملتے ہی پرچہ ہوائی ڈاک سے روانہ کیا جائے گا :

برطانیہ اور مغربی یورپ — (۱۸) اٹھارہ برٹش پونڈ

Mr. Mustafa Shahab
28, weighton Road,
Harrow Weald
MIDDLESEX, HA3 6HZ
UK Phone No. 208-863-9343

سعودی عربیہ اور مشرق وسطیٰ — (۴۰) چالیس ڈالر امریکن

Dr. Haneef Tareen M.D.
P.O. Box 378
AR AR NORTH
KINGDOM OF SAUDI ARABIA

کناڈا — (۴۵) پینتالیس ڈالر امریکن

Mr. M.H.K. Qureshi,
12, Harvey Court,
RICHMOND HILL, ONT. LRC 5R2
CANADA

ریاست ہائے متحدہ امریکہ — (۴۰) چالیس ڈالر

Mr. Adil Mansuri,
P.O. Box 922
HOBOKEN, NJ. 07030
USA

پاکستان — (۷۵۰) ساڑھے سات سو روپے پاکستانی

Janab Saba Ekram,
Divi. Manager,
Central Technologies Pte. Ltd.,
Plot No. 11, Sector 20,
Kaurangi Industrial area,
KARACHI-75180
PAKISTAN

باقی تمام غیر ملکی مقامات کے لئے (۴۵) پینتالیس ڈالر امریکن

ادارۂ ''شب خون'' کی کتابیں منگانے کے لئے بھی انھیں پتوں پر رابطہ کریں، شکریہ۔